عکس

(مراٹھی خاکوں کے اردو تراجم)

کتب خانہ

مترجم

محمد حسین پرکار

عکس

हिन्दुस्तानी प्रचार सभा, मुंबई

अ | ا

ہندستانی پرچار سبھا، ممبئی

ہندستانی پرچار سبھا کی اشاعت

پُ۔ لَ۔ دیش پانڈے

عکس

عکس

(مراٹھی خاکوں کے اردو تراجم)

☆ مصنف ☆

پ۔ل۔دیش پانڈے

☆ مترجم ☆

محمد حسین پرکار

© ۲۰۰۵ء

موج پرکاشن گرہ (ممبئی) کو اقتباسات کی اشاعت تجدیدِ اشاعت اور تراجم کے حقوق حاصل ہیں۔ باقی ماندہ حقوق پُ۔لَ۔دیش پانڈے فاؤنڈیشن (پونے) کے اختیار میں ہیں۔

نام کتاب	:	عکس (خاکے)
مصنّف	:	پُ۔ل۔دیش پانڈے
مترجم	:	محمّد حسین پرکار
اشاعتِ اوّل	:	مئی ۲۰۰۵ء
تعداد	:	پانچ سو (۵۰۰)
سرِ ورق	:	رضوان اشتیاق
کمپوزنگ	:	اعظمی گرافکس (عائشہ منزل، پائپ روڈ، کرلا، ممبئی۔۷۰)
مطبع	:	حنا پریس (کرلا، ممبئی)
ناشر	:	شری سبھاش وی سمپت (ٹرسٹی و اعزازی سیکریٹری) ''ہندستانی پرچار سبھا''، ممبئی۔
اہتمام	:	**اعظمی پبلی کیشن** (ممبئی)

ISBN 81- 902 - 435 - 3 - 5

AKS

(Marathi Sketches Written by : **P.L. Deshpande**)

Translation into Urdu

By : **MOHAMMAD HUSAIN PARKAR**

HINDUSTANI PARCHAR SABHA

M.G.M. BUILDING, NETAJI SUBHASH ROAD, MUMBAI - 02.

انتساب

برادرِ نسبتی ماہرِ اقتصادیات

ڈاکٹر محمد قاسم دلوی (ڈاکٹر ایم کیو دلوی)

کی

شفیق یادوں کے نام

جن کی علمی، تعلیمی اور سماجی خدمات

نئی نسلوں کے لیے

ہمیشہ مشعلِ راہ بنی رہینگی۔

فہرست

حرفِ آغاز	ڈاکٹر محمد اسحٰق جمخانہ والا
تاریخی دستاویز	ڈاکٹر رام پنڈت
عکس، زیرِ عکس	محمد حسین پرکار
ندا پردھان	
انتو بروا	
سکھا رام گٹنے	
کھانولکر	
ووڈ ہاؤس	
راؤ صاحب	
رُگ ویدی	

حرفِ آغاز

زبانوں کے قریب آنے کا معاملہ ہو یا تہذیبوں کے رشتے کا دونوں میں ترجمے کی اہمیت مسلّم ہے۔ جب تہذیبیں قریب آتی ہیں تب ترقّی کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ دنیاوی علوم ہوں یا تہذیبیں انھیں قریب لانے کا کام ترجمے کرتے ہیں۔ ترجمے کی ضرورت ہر دور میں رہی ہے شاید یہی وجہ ہے کہ ہر ملک میں ایک سے زائد زبانیں سیکھنے اور سکھانے کا رواج عام ہے۔ سائنس اور تکنالوجی کی مدد سے یہ کام اب اتنا آسان ہو گیا ہے کہ بین الاقوامی جلسوں اور قانون ساز ایوانوں میں کی جانے والی تقریر یں شرکاء اپنی اپنی زبان میں سن سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مشین وہ سارا کام نہیں کر پاتی جو ایک ماہر زبان کر پاتا ہے مشینوں کی حدیں مقرر ہیں انھیں دی ہوئی لفظیات کی مدد سے وہ صرف لفظی ترجمہ ہی کر دیتی ہیں۔ ہاں! یہ بات ضرور ہے کہ وقتی طور پر کام نکل جاتا ہے، کوئی رکاوٹ نہیں رہتی۔ عدالت میں مقدمے کے دوران اور دو ممالک کے نمائندوں کی گفتگو کے دوران یہ کام انٹر پریٹر یعنی ترجمان یا مفسّر انجام دیتے ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کی ترجمہ نگاری ہے جو اسی دم عمل میں آتی ہے۔ یہ کام زبانی ہوتا ہے تحریری نہیں اور نہ ہی آلات کی مدد سے۔ فنِ ترجمہ نگاری میں مہارت کی ضرورت ہے اور مہارت صرف ریاضت سے حاصل ہوتی ہے فنِ ترجمہ نگاری کو تخلیقی عمل بھی قرار دیا جاتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ چند دانشوروں کے نزدیک یہ ری کریشن ہے یعنی ایک زبان میں تخلیق کی ہوئی چیز کو دوسری زبان مین از سرِ نو تخلیق کرنا ۔

زیرِ مطالعہ کتاب ''عکس'' مراٹھی خاکوں کے اردو تراجم ہیں۔ کتاب میں شامل جملہ خاکے مراٹھی کے معروف قلم کار پ۔ لَ۔ دیش پانڈے کے لکھے ہوئے ہیں اور جسے محمد حسین پرکار نے اردو قالب میں ڈھالا ہے۔ خاکے اردو ادب کے لیے کوئی نئی صنف نہیں ہے۔ اردو میں اس کا آغاز انیسویں صدی میں ہوا اور بیسویں صدی میں اس کی نشو نما ہوئی ۔ بقول خلیق انجم یہ ''نثر میں غزل کا فن ہے'' خاکہ نگار کردار کے ذہن سے سوچتا ہے۔ لہٰذا جس کسی کی خاکہ نگاری کی جاتی ہے اُس کی خارجی اور داخلی دنیا کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ کسی شخص کی

سیرت کی بہتر عکاسی وہی کرسکتا ہے جو اس کے متعلق ذاتی علم رکھتا ہو۔ عبدالحق نے ''نام دیو مالی'' اور ''نور خان'' کے خاکے پیش کر کے اردو ادب کو نئی سمت عطا کی۔ رشید احمد صدیقی کے ''کندن''، ''حسن عبداللہ'' اور ''شیخ پیرو'' نیز اشرف صبوحی کے خاکے ''دلّی کی چند عجیب ہستیاں'' اپنی نوعیت کے منفرد خاکے ہیں۔ تا حال خاکوں اور خاکہ نگاروں کی فہرست طویل ہے۔

خاکہ نگار مصور رہوتا ہے الغرض اس کے تراشے مجسموں میں اچھے اور بُرے سبھی نقوش اُبھر آتے ہیں خاکوں کو ہم عام طور پر دو حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ شخصی خاکے اور خیالی خاکے۔ باریک بینی سے کام لیں تو ہمیں خاکے کئی خانوں میں بٹے ملتے ہیں جیسے تاثراتی خاکے، توصیفی خاکے، کرداری خاکے، معلوماتی خاکے، مزاحیہ خاکے، طنزیہ خاکے، ذاتی خاکے یا خودنوشت۔ اردو میں بیشتر خاکے تاثراتی خاکے ہوتے ہیں اور ان میں انشائیہ کا رنگ غالب ہوتا ہے۔

''عکس'' میں شامل خاکے پڑھ کر ہمیں مراٹھی قلم کاروں کے اسلوب خاکہ نگاری پر بطور مجموعی کچھ تاثر قائم کرنے میں مدد ملیگی۔ پُ۔لَ۔ دیش پانڈے اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ اُن کا تخلیق کردہ ادب مراٹھی ادب میں نمائندہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں یہ کہوں تو شاید بے جانہ ہوگا کہ ایسی کوشش پہلی بار کسی نے کی ہے کہ وہ مراٹھی خاکوں سے اردو والوں کو متعارف کرائے۔ محمدؔ حسین پرکار ہماری مبارکباد کے اس لیے بھی زیادہ مستحق ہیں کہ اُنھوں نے اس کام کے لیے پُ۔ل۔ دیش پانڈے کے خاکوں کا انتخاب کیا ہے اور ایک بہت بڑی ادبی خدمت انجام دی ہے۔ محمدؔ حسین پرکار کثیر لسانی ہیں اور اپنی ادبی کاوشوں کے لیے ادبی دنیا کا جانا پہچانا نام ہے۔ ہندستانی پرچار سبھا اُن سے مختلف پروجیکٹ پر کام کروا کر اردو اور مراٹھی کے لین دین میں اہم رول ادا کرسکتی ہے۔ میں ''عکس'' کی اشاعت کے لیے دونوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ دنیائے اردو میں ''عکس'' کی خوب پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر محمدؔ اسحق جمخانہ والا

(کارگزار صدر ہندوستانی پرچار سبھا)

تاریخی دستاویز

اُردو کی طرح مراٹھی میں بھی مزاحیہ ادب کی اچھی روایت ہے۔کولہٹکر، گڈکری، اچاریہ اُترے، باندیکر، ہر اسدار، شنکر پاٹل، پ۔ل۔دیش پانڈے یہ کچھ اہم نام ہیں اِن میں بھی پ۔ل۔دیش پانڈے کا نام سرِ فہرست لکھا جاتا ہے۔

۱۹۴۵ء کے بعد مراٹھی کے طنز ومزاح میں پ۔ل۔دیش پانڈے کے ڈراموں، سفرناموں، خاکوں اور مضامین کی اپنی حیثیت ہے۔اَمَمل دار، تُجھے آہے تُج پاشی، تی پھول رانی، یہ ڈرامے آج بھی مقبول ہیں اور مراٹھی تہذیب کا ایک حِصّہ بن چکے ہیں۔پ۔ل۔دیش پانڈے نے بچّوں کے لیے بھی مزاحیہ ایک بابی ڈرامے لکھے جواب تک کھیلے جا رہے ہیں۔نوے گوکل، وِٹھلا تو آلا آلا، وَیم موٹھم کھوٹم، یہ بچّوں کے ڈرامے کافی سراہے گئے ہیں۔ اَپُروَرنگ، اَپُروائی، زاوے تیا چیا دیشا، ونگ چترے، یہ سفر نامے مجتبیٰ حسین کے جاپان کے سفرنامے کی مجھے یاد دِلاتے ہیں۔طنز ومزاح کے مضامین میں مراٹھی ادب میں اُن کا کوئی ثانی نہیں ہے۔

گھوگیر بھرتی، کھلی، ہس وَنوک، گولا بیریز، نستی اُٹھا ٹھیو، بٹاٹیا چی چال، اَسامی اَسامی، ان عنوانوں کی کتابوں میں اپنے عہد کے سماجی، سیاسی، تہذیبی، شخصیتوں، وارداتوں، حادثوں کی باکمال منظرکشی ہے۔جس میں زبان کا لاجواب استعمال کرتے ہوئے طنز کے ساتھ اچھے بُرے معاشرے کی عکّاسی کی گئی ہے۔ ہر مضامین کا ہر جملہ پڑھ کر قاری لوٹ پوٹ ہوجاتا ہے۔مہاراشٹر کے ہر علاقے کی اپنی زبان کے اعتبار سے، غلط فہمیوں کے اعتبار سے عقیدوں کے بارے میں کچھ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے اُنکی شناخت بنی ہوئی ہے۔پ۔ل۔دیش پانڈے نے اسی کو اپنے سفرناموں، ڈراموں، مضامین اور خاکوں کا موضوع بنایا

ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کا گہرا مطالعہ، زبان پر غیر معمولی گرفت اور واحد اسلوب ان سبھی صِنفِ ادب میں اُن کے قلم کو کامیاب کرنے میں مددگار ثابت ہوئے۔یہی بات ہم مشتاق احمد یوسفی کے مضامین کے بارے میں بھی کہہ سکتے ہیں۔ابنِ انشاء، شفیق الرحمٰن، عظیم بیگ چغتائی کا جس طرح اُردو طنز و مزاح میں اپنا ایک مقام ہے مگر پھر بھی مشتاق احمد یوسفی کی بات کچھ اور ہی ہے۔ٹھیک اسی طرح پُ۔لَ۔دیش پانڈے کے بارے میں کہا جاسکتا ہے۔

مراٹھی خاکہ نگاری میں پُ۔لَ۔کے مقابلے میں کوئی بھی ادیب اب تک نہیں آپایا۔اُردو میں شاہد احمد دہلوی، منٹو ، ساحر کے نام میں لوں گا مگر زیادہ تر خاکے ادیبوں کے ہی ہیں۔پُ۔لَ۔دیش پانڈے نے نہ صِرف ادیب ، فنکاروں کے خاکے لکھے بلکہ کچھ خاکے خیالی شخصیتوں کے بھی ہیں جن کو پڑھتے ہوئے ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اِن سے ہم کبھی مِلے ہیں، اِن سے گفتگو کی ہے، اِن کے ساتھ وقت گزارا ہے۔ نام چاہے کچھ اور ہو مگر یہ شخص تو ہے وہی جسے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔منٹو کے خاکوں میں پری چہرہ نسیم ، اشوک کمار، میراجی، تین گولے ، آغا حشر کاشمیری یا ساحر کا لکھا ہوا دیویندر ستیارتھی، شاہد احمد دہلوی کا رشید احمد صدیقی یہ سبھی خاکے اس قسم کے ہیں جو بھلائے نہیں بھولتے۔

پُ۔لَ۔دیش پانڈے کی کتاب ''ویکتی آنی ولّی'' میں انتو بروا، یہ کوکن کے رتنا گیری نامی شہر کا ایک خاکہ مراٹھی ادب میں بے حد مشہور رہے۔پرکار صاحب نے اس کا ترجمہ بھی بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔''اَنتو بروا'' کے طنز کا وار بے حد گہرا ہوتا ہے۔ہر چیز ہر بات پر جملے کسنا اس کی عادت سی ہے۔ہر جملہ جیسے فنکارانہ انداز سے تراشا ہوا ہے وہ مائتھالوجی سے بھی نکلتا ہے، سیاست اور تہذیبی رنگ سے بھی نکھرتا ہے۔اپنی زندگی میں پُ۔لَ۔نے انسانی رہن سہن، مزاج کے جو مختلف پہلو دیکھے، اُن کے برتاؤ کے پیچھے چھپی سائکالوجی کا معائنہ کیا اور اُن سبھی باتوں کو ذہن میں محفوظ کر اُنھیں الگ الگ خاکوں میں ڈھال دیا۔ معاشرے کی بے وقوفیاں ، دِکھاوا ، خودغرضی، خودداری، اِیگو جیسی کئی خامیوں پر طنز کرتے ہوئے اپنے خاکے مکمّل کیے۔لفاظی، کنٹراورسی، اینٹی کلائمکس، پیروڈی جیسی کئی باتوں سے اُن کے قلم سے زندہ خاکے، مضامین ہمیشہ قابلِ تعریف بن گئے ہیں۔''اَنتو بروا''۔''سکھارام گٹنے''۔''نندا پردھان'' یہ خاکے فرضی ہیں

جیسے امتیاز علی تاج کا ''چاچا چھکّن''، مشتاق احمد یوسفی کا ''میر صاحب'' وغیرہ کردار ہیں۔ مگر پُ۔لَ۔ دیش پانڈے نے ''ووڈ ہاؤس'' (انگریزی مزاحیہ ادب کے شہنشاہ) چِ۔ تر یہ۔ کھانولکر (مراٹھی کے ایک ذہین ڈرامہ نگار، ناول نگار اور شاعر) ''راؤ صاحب'' (ایک مراٹھی سنگیت ڈراموں کا شوقین) اور پُ۔لَ۔ کے سُسرال کے ایک بزرگ شخص ''رُگ ویدی'' کے خاکے یہاں پرکار صاحب نے اُردو قاری کے لیے پیش کیے ہیں۔ خود پرکار صاحب کوکن کے باشندے ہیں۔ اُردو مراٹھی پر ان کی یکساں گرفت ہے۔ گھروں میں کوکنی مراٹھی کا وہ استعمال کرتے ہیں۔ مہاراشٹر سنسکرتی کا حِصّہ ہونے کے ناطے پُ۔لَ۔ دیش پانڈے کا اعلیٰ ادب یقیناً اسکولی زمانے سے اُن کے پڑھنے میں آیا ہے۔ اسی لیے اس کام کے لیے اُن سے بہتر کوئی اور مجھے دکھائی نہیں دیتا۔

پُ۔لَ۔ کے لکھے شاہکار خاکوں میں ''چیستم جی''۔ ''ناموپریٹ''۔ ''باپوکانے''۔ ''نارائن''۔

''بیڑو''۔ ''اِنٹرنیشنل دِکشت''۔ ''بھیّا ناگپورکر''۔ ایسے کئی نام گنوائے جاسکتے ہیں۔ پھر اس کتاب میں مترجم نے جو خاکے پیش کئے ہیں وہ بھی اُتنے ہی نمائندہ خاکے ہیں۔

جناب محمد حسین پرکار مراٹھی ماحول میں پلے اور بڑے ہوئے۔ مراٹھی سے انھیں بیحد لگاؤ ہے۔ نور پرکار جو مراٹھی اردو کے معتبر مترجم مانے جاتے ہیں وہ ان کے سگے بھائی ہیں۔ ادبی لین دین یا آدان پردان میں اس خاندان کا نام لینا ضروری ہوگیا ہے۔ نور پرکار کے کام سے متاثر ہوکر کئی اردو والے ترجمے کی اور مُڑے اور مترجم کا عہدہ پاگئے۔ محمد حسین پرکار میں ترجمہ کرنے کی صلاحیت نور پرکار کی طرح ہی ہے۔ ایک بار میں نے اُنھیں پُ۔لَ۔ دیش پانڈے کے خاکوں کے مجموعے دکھا کر اُن کا اُردو میں ترجمہ ہونا ضروری ہے ایسا کہا تھا اور اُنھوں نے بھی شدّت کے ساتھ یہ چیلنج قبول کرتے ہوئے چند مہینوں میں یہ شہکار کام انجام دیا۔ یہ خاکے مراٹھی سے سیدھے سیدھے اُردو میں ہوئے ہیں۔ اس طرح فِلٹر لینگویج ہندی یا انگریزی کے بِنا اوریجنل زبان مراٹھی سے اُردو میں ترجمہ کرنے کی قابلیت رکھنے والے بہت کم لوگ مہاراشٹر میں ہیں۔ ان میں ڈاکٹر عبدالستار دلوی، اگاسکر برادرس، سلام بن رزّاق، یعقوب راہی، وقار قادری، ڈاکٹر اسد

اللہ ،قاسم ندیم ایسے کچھ نام ہیں ان میں محمد حسین پرکار کا بھی نام اب شامل ہوگیا ہے۔جس طرح جی۔اے۔کلکرنی کے افسانوں کو مراٹھی سے اردو میں لانے کی جرأت صرف سلام بن رزاق کر سکے اُسی طرح (مراٹھی کے منتخب افسانوں کے کئی مجموعے اب تک شائع ہوئے پر عظیم افسانہ نگار جی۔اے۔کلکرنی کی کہانیوں کو سوائے اِن کے کسی نے ہاتھ نہیں لگایا) پُ۔لَ۔دیش پانڈے کے خاکوں کو بھی پرکار صاحب کے سوا کوئی ترجمے کے لیے لے نہیں پایا۔

جو ترجمہ اوریجنل زبان سے ہو اس کی اہمیت سب سے زیادہ ہے اور وہی قابل اعتبار ہے اس بات سے میں قطعی انکار نہیں کرتا مگر دو زبانوں کو سیکھنے والوں کی گھٹتی تعداد مراٹھی اردو میڈیم کے اسکولوں میں گھٹتے ہوئے کلاسس کو مدّ نظر رکھتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ فِلٹر لینگویج یا لِنک لنگویج ہندی کا سہارا لینا وقت کا تقاضا ہے دنیا بھر کا ادب ہماری علاقائی زبانوں میں انگریزی کے ذریعے پہنچتا ہے اور ہر ملک میں انگریزی فِلٹر لینگویج کا رول ادا کر رہی ہے۔پُ۔لَ۔دیش پانڈے کی ساری تخلیقات اکیلے پرکار تو نہیں کر سکتے اور اگر مراٹھی سے سیدھے اُردو میں ترجمہ کرنے والے پرکار ہمارے یہاں دو چار ہی ہیں تو کیوں نہ ہم ہندی کی مدد سے بچا ہوا ترجمے کا کام پورا کریں ؟ مراٹھی اُردو ترجمے کی تاریخ میں پرکار صاحب کا یہ کارنامہ یقیناً درج ہوگا اس میں مجھے کوئی شبہ نہیں۔اس تاریخی دستاویز کے لیے مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر اور جناب محمد حُسین پرکار صاحب کو میں مبارکباد دیتا ہوں۔

ڈاکٹر رام پنڈت

عکس ۔۔۔۔زیرِ عکس

مراٹھی ادب کی منتخب کہانیوں، شعری تخلیقات اور ڈراموں کے تراجم کے بعد ادب کی ایک اور اہم صِنف خاکوں کی جانب مُڑا ہوں۔ وہ بھی پُ۔لَ۔دیش پانڈے کے لکھے خاکوں کی طرف پُ۔لَ۔ دیش پانڈے کی تخلیقات مراٹھی ادب میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ میں اُن کے ڈرامے کالج کی طالب علمی کے زمانے سے دیکھتا آیا ہوں۔ اتوار کے دن جب دارالاقامہ میں رہنے والے کالج کے ساتھی طلبہ اپنی شب بیداری کی وجہ سے عام طور پر دیر سے اُٹھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ میں اور میرے چند ڈراموں کے شوقین احباب جوگیشوری سے سیدھے بھارتیہ ودیا بھون ٹھیک ۹ ر بجے صبح پہنچ جاتے اور تین گھنٹے مسلسل قہقہوں میں اور انوکھے لطف اندوز ماحول میں گزارتے۔ مراٹھی ڈراموں کا اپنا ایک خاص انداز ہے۔ ڈرامے لکھنا، پڑھنا اور دیکھنا یہ اُن کی ترجیہات میں سے ہے۔ پُ۔لَ۔ دیش پانڈے ہمارے کالج اسماعیل یوسف کالج کے سابق طالب علم تھے لہٰذا اُن سے اور اُن کے ادب سے ایک خاص اپنائیت تھی ہمیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہم جوگیشوری سے چوپاٹی بھارتیہ ودیا بھون پہنچ جاتے تھے۔ اکثر اوقات ڈراموں میں مکالموں کا طنز و مزاح اتنا برمحل ہوتا کہ وہ مزاحیہ فقرے اور طنزیہ جملے براہِ راست تماشائیوں میں موجود آس پاس کے لوگوں پر چست ہوجاتے اور ہمارا لطف دونا ہوجاتا۔ ذرا سوچئے کہ ہمارا ڈرامہ نویس وادا کار کہہ رہا ہے کہ خواتین کو دوسروں کے نوکر اور دوسروں کے شوہر میں نہ جانے کتنی ساری خوبیاں نظر آتی ہیں۔ اس دوران ہمارے پڑوس میں بیٹھے نوجوان جوڑے ایک دوسرے کی طرف بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے

ہوں تو ہماری خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہتا۔ پھر کسی منظر میں بیوی اپنے شوہر سے کہہ رہی ہے ہو کہ دیکھو بچّہ مسلسل روئے جا رہا ہے اور میں ڈرامے کا ذرا بھی لطف نہیں لے پا رہی ہوں ذرا اسے باہر لے جا کر بہلا تو لاؤ اور اسی اثنا پُ۔لَ۔دیش پانڈے اسٹیج پر وہی فقرے دوہرا رہے ہوں تو کیسا عملی روپ ہمیں دیکھنے ملتا۔ ایسے لمحات بھلائے نہیں بھول پاتے ہم۔ پ۔لَ۔دیش پاندے کا مشاہدہ، اُسے ڈرامے میں پیش کرنے کا طریقہ اور بِنا رکاوٹ تین گھنٹوں تک مختلف کرداروں کے مکالمے ٹھیک اُن کرداروں کی آواز میں پیش کرنا صِرف پُ۔لَ۔دیش پانڈے کا حِصّہ تھا اِسے ماننے سے کوئی بھی انصاف پسند قاری اور تماشائی انکار نہیں کر سکتا۔

ہم طلبہ ساتھیوں میں اس بات پر ضرور بحث ہوتی کہ آخر پُ۔لَ۔دیش پانڈے بارش کے تین مہینوں میں کیوں کر نیا ڈرامہ لکھ پاتے ہوں گے اور باقی کے ۹ مہینوں میں اپنے لکھے ڈرامے کے انگنت شو کرنا اور کامیابی سے کرنا اُن کے لیے کیوں کر ممکن ہوتا ہوگا۔ سچ یہی ہے۔ ایسا ادیب، ڈرامہ نویس، اداکار، ناول نگار، خاکہ نویس، طنز و مزاح نگار صدیوں میں پیدا ہوتا ہے اور وہ صدی اُس کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔

پُ۔لَ۔دیش پانڈے کی تحریر میں جوگیشوری کا ذکر ملتا ہے۔ اُنھوں نے اسماعیل یوسف کالج اور کالج سے قریب بنی رہائشی سوسائٹی کا ذکر کیا ہے جہاں وہ رہا کرتے تھے۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ اُنھوں نے جن افراد کا ذکر کیا ہے اُن سے ملنے اور انھیں قریب سے جاننے کا موقع بھی مجھے نصیب ہوا۔ ڈاکٹر سلگر کے گھر میرا آنا جانا بھی رہا ہے۔ اُن کا ایک بیٹا اور اُن کی بیٹی اُسی دوران کالج میں پڑھتے تھے لہٰذا ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ یوں بھی اسماعیل یوسف کالج کے طلبہ اور اساتذہ سب کا ایک دوسرے کے ساتھ رشتہ ایک خاندان کے افراد جیسا تھا اور آج بھی برقرار ہے۔

الغرض پُ۔لَ۔دیش پانڈے کا تخلیق کردہ ادب میرے مطالعہ میں رہا اور اُس سے میں کافی متاثر ہوا۔ اُن کے خاکوں کا انداز بالکل ہی منفرد ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے اُن کی اپنی ایک الگ پہچان ہے۔ ایک روز محترم ڈاکٹر رام پنڈت صاحب سے اردو۔ مراٹھی کے آدان پردان پر بحث ہو رہی تھی۔ انھوں نے دورانِ گفتگو کہا کہ پُ۔لَ۔دیش پانڈے کے خاکے اردو میں منتقل ہو جائیں تو ایک بہت بڑا ادبی کارنامہ ہوگا۔ میں نے یہ ذمہ داری قبول کر لی اور اُسے پوری کرنے میں جُٹ گیا۔ اَنتو بروا جیسے کردار میری

آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔انتو بروا رتنا گیری شہر کا ایک کردار ہے۔ میں خود رتنا گیری ضلع کا باشندہ ہوں۔ میرا آبائی گاؤں بانکوٹ ہے جو رتنا گیری ضلع کے منڈن گڑھ تعلقہ میں واقع ہے لہٰذا انتو بروا جیسے کردار میری آنکھوں کے سامنے سے ہو گزرے ہیں۔ میری تعلیم اُردو میڈیم سے ہوئی لیکن جماعت دسویں تک مراٹھی میرا ایک مضمون رہا ہے۔ مراٹھی اخبارات کا مطالعہ، مراٹھی میں خط و کتابت یہ معمول میں شامل تھا۔ گھر میں کوکنی کے استعمال، مراٹھی تہذیب وتمدّن سے واقفیت نے میری نِصف سے زائد مشکل حل کردی اور تراجم میں یہ باتیں میرے لیے معاون و مددگار ثابت ہوئیں۔ مراٹھی اور ہندی دونوں کا رسم الخط دیوناگری ہے۔ اردو زبان کے اعتبار سے ہندی سے کافی قریب ہے اس کے باوجود پڑھنے میں مجھے ہندی ثقیل اور غیر مانوس سی معلوم ہوتی ہے اور مراٹھی پڑھنے میں ایک گونہ لطف آجاتا ہے۔ مراٹھی کا ادب، اُس کی لفظیات اور اس کی ساری فنّی باریکیاں جانی پہچانی لگتی ہیں لہٰذا مراٹھی ادب کو اُردو میں منتقل کرتے ہوئے کہیں دشواری بھی آجائے تو اس پر بار بار غور کرنے سے اس کا حل نکل آتا ہے اور ترجمہ سو فیصدی اطمینان بخش نہ ہوا تب بھی یہ اعتماد برقرار رہتا ہے کہ دونوں زبانوں کی روح کو مجروح ہونے نہیں دیا ہے اور ثالث کا رول بخوبی نبھایا ہے۔

''اَنتو بروا'' کا کردار جانا پہچانا کردار ہے۔ رتنا گیری ضلع کے باشندے بے حد ذہین اور حاضر جواب ہوتے ہیں۔ اُن کی حسِ مزاح بہت تیز ہوتی ہے۔ اُن کے پاس کسی بھی سوال کا جواب، کسی بھی مسئلہ کا حل موجود رہتا ہے۔ اِن خوبیوں کے ساتھ قدرت نے اُنھیں انسانی پیار کا بیش قیمت وِرثہ عطا کیا ہے۔ یہ پیار اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب وہ اپنی عمر کے آخری مراحل میں ہوتے ہیں۔ پُ۔ لَ۔ دیش پانڈے کی زبان میں کہیں تو وہ کٹھل کی طرح باہر سے سخت اور اندر سے نرم وشیریں ہوتے ہیں۔ اُن کی یہ خوبی کٹھل کی طرح بہت زیادہ پک جانے (معمّر ہونے) پر ظاہر ہوتی ہے۔

''سکھارام گٹنے'' کا کردار بھی انجانا کردار نہیں ہے۔ ایسے اشخاص ہمیں جا بجا ملتے ہیں جو ادبی دنیا میں کھوئے رہتے ہیں اور عام انسانوں سے مختلف طرز کی زندگی گزارتے ہیں۔ اُن کی زندگی میں تصنّع زیادہ ہوتا ہے یہی اُن کی شناخت بھی ہے۔ ایسے لوگوں کی اکثریت کا بیشتر حِصّہ اُن لوگوں سے بھرا پڑا رہتا ہے جو نہ ہی ادیب وشاعر ہوتے ہیں اور نہ ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ البتہ ادبی کتابوں کے مطالعہ اور ادبی محفلوں میں

اُن کی موجودگی اُنھیں ادبی لبادہ اوڑھ کر چلنے کے گُر سکھاتی ہے۔ اُن کے نپے تُلے جملے سُن کر اساتذۂ ادب اور دانشور جھنجھلا اُٹھتے ہیں اور بیزار ہوجاتے ہیں لیکن اظہار نہیں کرپاتے کہ حدّ ادب کا یہی تقاضا ہے۔

''راؤ صاحب'' کا کردار بھی کوئی انوکھا کردار نہیں ہے۔ ناٹک کے دلدادہ اور موسیقی کے شائقین کو قریب سے دیکھئے کہ وہ کس قدر حساس ہوتے ہیں۔ اِن فنون سے جڑے ہوئے افراد سے یعنی فنکار سے ذرا سی بھی غلطی ہوجائے تو وہ راؤ صاحب جیسے لوگوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہوجاتی ہے۔ وہ فنکار کو ٹوکنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کرتے۔ ہاں! جو صحیح روِش پر اپنا رول ادا کرتے ہیں اُن پر وہ جان چھڑکتے ہیں۔ اُن کی یہی خوبی اُن کے لیے بہت سے قدردان پیدا کرتی ہے۔ وہ بے حد دوست نواز ہوتے ہیں۔ کبھی کسی اختلاف کی وجہ سے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی نوبت آجائے تب بھی حقِ دوستی ادا کرنے سے باز نہیں آتے۔ اُن کا کہنا ہوتا ہے کہ کورٹ کا معاملہ الگ چیز ہے اور دوستی الگ۔ عدالت اپنا فیصلہ سنائے گی لیکن اس سے ہماری دوستی میں فرق کیوں آئے۔

''کھانولکر'' کا خاکہ ہمیں فن و ادب سے منسلک اُن شخصیتوں کی یاد دلاتا ہے جو عام روش سے ہٹ کر ادب کی کسی ایک صنف میں اپنا مقام بنالیتے ہیں اور اسی اسلوب و نہج پر دوسری صِنف میں طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن اہلِ نظر کے نزدیک ان دونوں میں توازن نہیں ہوتا۔ ایک کمزور دوسری کامیاب تخلیق لگتی ہے اور وہ تخلیق کار کو الجھن میں پھنسا ہوا پاتے ہیں۔ اُنھیں تخلیق کار کے ساتھ ہمدردی ضرور ہوتی ہے لیکن وہ اس کا اظہار بھی نہیں کرپاتے جس کا انھیں دائمی دکھ بھی رہتا ہے۔ بہر حال ایسے تخلیق کار ادب پر اپنی کچھ چھاپ ضرور چھوڑ جاتے ہیں۔

''ووڈ ہاؤس'' بحیثیتِ مزاح نگار بین الاقوامی شہرت کا حامل ہے۔ پُ۔ لَ۔ نے (پُ۔ لَ۔ دیش پانڈے کو مراٹھی ادب میں اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے) ووڈ ہاؤس کا کردار اتنی خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ اُس کے ادب، اُس کی زندگی، اُس کے حِس طنز و مزاح کی مُنہ بولتی تصویر آنکھوں کے سامنے اُبھر آتی ہے ایسے انسان سخت سے سخت مصیبت کا بڑی دلیری سے مقابلہ کرتے ہیں اور مصیبت کے دنوں کا ذکر بھی ایسے انداز سے کرتے ہیں مانو وہ مصائب کا مضحکہ اُڑا رہے ہوں۔ ایسے لوگوں سے تکالیف خود ہار تسلیم کرلیتی ہیں

وہ لوگوں کے لعن وطعن پر غالبؔ کی طرح ہنستے ہیں کہ ان کم ظرف لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ عمر کے کس حصے میں کیسی دشنام اور کیسے لعن وطعن طبعیت پر گراں گزر سکتے ہیں۔

''نند اپردھان'' کا خاکہ کالج کی زندگی کا خوبصورت نقشہ پیش کرتا ہے۔ایسے جیالے اور خوبرو انسان کالج کی زندگی اور باہری زندگی میں خوب رنگ جماتے ہیں۔ کالج میں حاصل کی ہوئی تعلیم اور سوشل ورک سے پایا ہوا تجربہ، ڈرامے کھیلتے کھیلتے ڈراموں کے کرداروں سے ملا ہوا زندگی گزارنے کا سلیقہ میدانِ عمل میں قدم رکھنے کے بعد بہت کام آتا ہے یہ نند اپردھان کے خاکے سے واضح ہو جاتا ہے۔ وہ اپنا غم چھپانا جانتا ہے۔ دنیا کو بازیچۂ اطفال جان کر شب وروز ہونے والے تماشے اس طرح نظرانداز کر دیتا ہے کہ اُس کی اپنی شبیہہ اُبھر کر اپنے انمٹ نقوش چھوڑ جاتی ہے۔

''رُگ ویدی'' کی تصویر میں اسلاف کے اعلیٰ اقدار کی داستان پوشیدہ ہے۔ایسے افراد سماج کا ایک اٹوٹ حصہ ہوتے ہیں اور اُن کے چل بسنے کے بعد ایک نامعلوم سا خلاء چھوڑ جاتے ہیں ایسے لوگوں کی قدر اپنے وقت میں کم اور عدم موجودگی میں زیادہ ہوتی ہے۔ گھر کے افراد، خویش واقربا اُنھیں اُس وقت یاد کرنے لگتے ہیں جب دوسرے اُن کی خدمات کو سراہتے ہوئے اُن کی زندگی کے بارے میں جاننے کی خواہش کرتے ہیں۔ بہرحال انسان اپنے کاموں سے زندہ رہتا ہے۔

تمھیں کہتا ہے مردہ کون تم زندوں کے زندہ ہو   تمھاری نیکیاں زندہ تمھاری خوبیاں باقی

پ۔ل۔ کے لکھے خاکوں کا ترجمہ کرتے ہوئے مجھے کئی مراحل وتجربات سے گزرنا پڑا۔اُن کی تحریر میں اعلیٰ ادب، مائی تھالوجی، سماجی اقدار، مقامی زبان کی چاشنی، وہاں کی آب وہوا، پیداوار غرض ہر وہ چیز آتی ہے جہاں کا وہ کردار پیش کررہے ہیں۔اُن کا طنز ومزاح الگ نوعیت کا ہوتا ہے۔قوسین میں وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ کافی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔لہٰذا اُن کی تخلیقات کا ترجمہ کرتے وقت جہاں کچھ کچھ مشکلات سے گزرنا پڑا وہیں اپنے علم میں کچھ اضافہ بھی ہوا اس کا اعتراف کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ترجمہ کرنے میں کوئی خامی، کوئی غلطی، کوئی نقص رہ نہ جائے اس لیے جہاں کہیں کوئی لفظ، کوئی کی فقرہ میری سمجھ میں نہیں آیا اُس کی ہر ممکنہ طریقے سے معنی ووضاحت حاصل کی اور اپنی معلومات میں اضافہ کرلیا۔ ان

کوششوں کے باوجود میرا ترجمہ جملہ نقائص سے پاک ہے ایسا میں نہیں کہہ سکتا۔ میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ یہ قابلِ قبول ترجمہ ضرور ہے البتہ میرے دِل میں کسک سی باقی ہے کہ اس سے بہتر ترجمہ ہوسکتا تھا اور اسی کسک کو میں اپنی کامیابی کا ضامن سمجھتا ہوں۔

میں شکرگزار ہوں مالکِ دو جہاں کا اور احسان مند ہوں اس کی بے پناہ عنایتوں کا کہ یہ پروجیکٹ پائے تکمیل کو پہنچا سکا۔

میں ممنون و مشکور ہوں ''موج پرکاشن گرہہ'' کھٹاؤ واڑی، گرگاؤں، ممبئی ۔۴ اور پ۔ ل۔ دیش پانڈے فاؤنڈیشن بھانڈارکر روڈ، پونے ۔۴، کا جنھوں نے مجھے بخوشی ترجمہ کرنے کی اجازت عطا کی۔

میں ہندستانی پرچار سبھا کی منتظمہ کمیٹی کا تہہ دِل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے ان خاکوں کو شائع کرکے اس ادبی کوشش میں میری ہمّت افزائی کی۔ میں محترم ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا صاحب، کارگزار صدر ہندوستانی پرچار سبھا کا بے حد ممنون و مشکور ہوں کہ اُنھوں نے حرفِ آغاز لکھ کر میری کوششوں کو سراہا ہے اور اپنی نیک خواہشات سے نوازا ہے۔ میں ہندستانی پرچار سبھا کی اعزازی سیکریٹری محترمہ کمو حافظ کا صاحبہ کا بے حد شکرگزار ہوں کہ اُنھوں نے ہمیشہ کی طرح میری اس کتاب کی اشاعت میں بے حد دلچسپی لی اور کور ڈزائن تیار کروانے میں بھی پیش پیش رہیں۔ میں پرنسپل پریمانند گوویکر صاحب، اعزازی خازن ہندستانی پرچار سبھا کا بے حد مشکور و ممنون ہوں کہ اُنھوں نے اس کتاب کی تیاری میں ہر مرحلے میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا اور اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا۔

میں اپنے عزیز دوست ڈاکٹر رام پنڈت کا بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے پیش لفظ لکھ کر اس کتاب کی اہمیت کو دوبالا کردیا ہے۔

میں اپنے ساتھیوں عزیزہ مِس یاسمین شیخ سلمہا اور عزیزی آصف پٹھان سلمہُ کا شکریہ ادا نہ کروں تو یہ ناشکرگزاری ہوگی جو ہمیشہ میری تخلیقات کی اشاعت اور میری ادبی خدمات میں میرے شانہ بہ شانہ کھڑے رہتے ہیں۔

میں جناب منوہر مانڈ اڈ کر کا بے حد ممنون و مشکور ہوں جنھوں نے ترجمے کی اجازت حاصل کرنے میں میرے ساتھ بھر پور تعاون کیا اور متعدد بار میرے ساتھ ''موج پر کاشن گرہ'' تک تشریف لے آئے۔

میں اپنے دوست جناب اشتیاق سعید کا بے حد شکر گزار ہوں جن کا ڈی ٹی پی، کور ڈزائن کی تیاری اور طباعت کے مراحل میں نہ صرف بھر پور تعاون حاصل رہا بلکہ ادبی خدمت کا جذبہ بھی کارفرما رہا۔

میں اپنے قارئین کا بھی بے حد ممنون و مشکور ہوں جو اس کتاب کی اشاعت کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ لیجئے انتظار کی گھڑیاں ختم ہو چکی ہیں۔ کتاب حاضرِ خدمت ہے۔ اب اس میں کمی بیشی کی نشاندہی کرنا آپ کی ادبی ذمہ داری ہوگی۔

محمد حسین پرکار

۲۱ رجنوری ۲۰۰۵ء

ندا پردھان

سنیچر کی دوپہر آفس چھوٹا۔ فورٹ سے میں گھومتے نکلا۔ گھڑیال کی ایک دکان کی نمائش کھڑکی کے سامنے کھڑے رہ کر کانچ کے پیچھے ترتیب دی ہوئی گھڑیوں کو میں دیکھ رہا تھا۔ انگریزی میں اسے ''ونڈو شاپنگ'' کہتے ہیں۔ بڑی بڑی ڈکانوں میں نہایت پرکشش طریقے سے بیچنے کی چیزیں بڑے سلیقے سے لگائی ہوئی رہتی ہیں۔ اکثر قیمت کا لیبل الٹا کر کے رکھا ہوتا ہے۔ وہاں کی سب سے پسندیدہ شئے کی سب سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ پیچھے ایکبار ایک دکان کی کانچ کے پیچھے رکھی ہوئی ٹائی میں نے دیکھی وہ ٹائی مجھے اچھی لگی۔ شاید وہ اتنی خوبصورت نہ بھی ہو، کیونکہ وہ اس کانچ کے پیچھے بہت دنوں سے تھی۔ ایک دن ہمّت کر کے میں اس دکان میں داخل ہوا اور اس ٹائی کی قیمت معلوم کر کے باہر نکل آیا۔ ٹائی کی قیمت تیس ۳۰/ روپے ہوسکتی ہے یہ جان کر میرا گلا روندھ گیا۔ اب وہ گھڑیاں دیکھتے وقت بھی میری کلائی پر کونسی اچھی لگے گی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ خواہ مخواہ ہی۔ سچ کہا جائے تو کلائی پر جچنے سے زیادہ جیب کی برداشت کا مسئلہ اہمیت کا حامل تھا۔ اس کے باوجود من ہی من میں اس شوکیس کی ساری گھڑیاں اپنے ہاتھ میں چڑھا کر دیکھ لیں۔ یوں تو میں نے سوٹ بھی چڑھا لئے ہیں۔ فرنیچر کی دکان کے مختلف فرنیچر پر میں بیٹھا ہوں۔ من ہی من میں وہاں بھری بھری گدّیوں والے پلنگ پر لیٹا ہوں۔ ایک دو سو روپیوں کا ریڈیو خریدنے کے لئے ہمیں پنج سالہ منصوبہ تیار کرنا پڑتا ہے.....! ڈومبولی تا بوری بندر تک فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کی خواہش آج تک پوری کرنے کا موقع نہ آسکا میرے لیئے۔ میں کانچ سے اسی طرح گھڑیاں دیکھتے کھڑا تھا۔ نہ کہوں تب بھی من ہی

من میں اُداس ہو رہا تھا۔ اتنے میں میرے کندھے پر کسی کا ہاتھ پڑ گیا، اور آواز آئی '' ہلوٗ'' !

میں ایک قدم گھبرا کر پیچھے مُڑا۔

'' نندا ! ہاں نندا......نندا ہی تو۔۔۔۔۔۔''

'' بھُلا نہیں ہے تو ! ''

نندا کو ایک جھلک دیکھنے والا بھی نہیں بھولے گا۔ یہاں تو میں نے چار سال کالج کے اس کے ساتھ گذارے تھے۔ میں تو کیا بلکہ ہمارے کالج میں اس وقت پڑھنے پڑھانے والے کوئی بھی اسے بھول نہیں سکے .... لیکن آج لگ بھگ بیس سال بعد ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ لڑکیاں تو اس سے خوش تھیں ہی، لیکن کالج کے سارے ہی لڑکے بھی خوش تھے.....! نندا پردھان یہ نام ہم گیری کوپر، فریڈرک مارچ، ڈک پاویل، رومن نوھیارو، ان ناموں کے ساتھ لیا کرتے تھے۔ دیوالی کرسمس کی چھٹیوں میں اپنے ہاسٹل کے کمرے میں رہنے والا نندا پردھان ! کالج کے انگریزی ڈراموں میں پارسی اور کرسچن لڑکے لڑکیوں کے گروپ میں کام کرنے والا نندا پردھان۔ میں بی۔اے میں تھا، اس وقت نندا نے ہیملیٹ کا رول ادا کیا تھا۔ اس کے بعد میں نے برٹش رنگ بھومی کا ہیملیٹ بھی سنیما میں دیکھا۔ لیکن ذہن میں نندا کا ہیملیٹ پکّا بیٹھ گیا ہے۔ اتنا شیرین ہیلمیٹ ! فرینی سکلات والا اوفیلیا تھی۔ نندا فرینی سے بیاہ کریگا۔ یہ افواہ تک ان دنوں گشت کر رہی تھی البتہ نندا کے بارے میں ایسی افواہیں ہر دو ماہ بعد اُٹھا کرتی تھیں۔ مجھے لگتا ہے کالج کی سب سے خوبصورت لڑکی کے ساتھ نندا کی شادی ہو ایسی ہر کسی کی خواہش ہوگی۔ اس ضمن میں کالج کے دیگر خواہشمند حضرات نے نندا کو اسپورٹس مین اسپرٹ سے واک اووھر دے دیا تھا۔

لگ بھگ پونے چھ فٹ اونچا ، دُبلا پتلا ، نیلی آنکھوں والا ، چھوٹے سے پتلے ہونٹوں والا، گھونگھروالے بالوں والا نندا پہلی نظر میں ہندو لڑکا معلوم ہی نہیں ہوتا تھا اس پر وہ انگلش بولنے والے کاسموپولٹین گروپ میں رہتا تھا ! دراصل اسکی اور میری کالج کی دوستی کسی طرح جم گئی۔ وہ بھی اس لمحے تک میرے لیئے معمہ سے کم نہیں ہے ۔ انگلش آنرز کی کلاس میں ہم سات آٹھ لڑکے لڑکیاں تھے اُن میں مکمّل دیسی میں تھا اور اندو ویلنکر نام کی لڑکی۔ اَردھ مگدھی میں جانے والی یہ لڑکی انگریزی کی کلاس میں محض فارم

بھرنے کی غلطی کی بناء پر بیٹھ رہی ہوگی ایسا میرا خیال تھا۔ نوگز والی ساڑی، جُوا، ہاتھ پر مردوں کے باندھنے جیسی بڑی گھڑی، ہاتھوں میں کتابوں کا بوجھ اور منگل گوری کے رت جگے سے آئی ہو ایسی نظر آنے والی یہ پاگل سی لڑکی جب انگریزی کے امتحان میں یونیورسٹی کے سارے انعامات لے گئی تب ہم اپنی گردن جھکائے اُسے مبارکباد دینے اُس کے گھر گئے تھے! درحقیقت کسی لڑکی کے گھر جاکر مبارکباد دینے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی، لیکن نندا میرے کمرے پر آیا تھا اُن دنوں میں بھکارداس ماروتی کے پاس چال میں ایک کمرہ لے کر رہا کرتا تھا۔ اُس دور کے پونے میں چار روپیوں کے کرائے میں جن سہولتوں کے ساتھ کمرہ ملا کرتا تھا، اس کمرے میں میں اور اَرگڑے نام کا ایک پارٹنر رہتے تھے۔ وہ شب و روز فلوٹ بجایا کرتا۔ پھر اس کا اور مالک کا جھگڑا ہوتا۔ میرے اس کمرے پر نندا آنے پر مجھے شرم سی محسوس ہوتی۔ تار پر میرا گھر پر دھویا ہوا پاجامہ اور پھٹا ہوا بنیان، شرٹ وغیرہ سوکھتے پڑا رہتا۔ اَرگڑے نے ایک پرانا چائے کا باکس حاصل کرکے اُسے اپنی نشست بنالیا تھا۔ اس پر بیٹھ کر وہ فلوٹ کا ریاض کرتا تھا۔ خوب بجاتا تھا، مگر بعد میں اسے پلوریسی ہوگئی۔

میرے کمرے میں ان بیکار سی دیواروں کے بیچ اور گرہن کے دن دان کرنے لائق کپڑوں کے درمیان ......نندا کھڑا تھا۔

'' ہمیں جانا ہے '' نندا نے کہا۔

'' کہاں؟ ''

'' اندو ویلنکر کے یہاں چل ''

اس طرح عجیب سی مختصر سی توڑ توڑ کر زبان میں بات کرنے کی اُس کی عادت تھی۔ آواز میں بھی اونچا پن تھا پر سخت نہ تھا، ایسا کچھ تھا۔ اُس پر ہر چیز اچھی لگتی اُس طرح آواز بھی اس پر جچنے والی تھی۔ نندا ایک بار گانے کے پروگرام میں میرے ساتھ نہرو شرٹ اور پاجامہ پہن کر آیا تھا۔ وہ اس لباس میں بھی اتنا خوبصورت نظر آرہا تھا کہ بُوا نے گاتے گاتے ایک بار اسے نمسکار کر دیا تھا۔ اُس روز وہ کمرے پر آیا تو میں بالکل گڑبڑا گیا۔ کچھ لوگ جنم سے ہی ایسا کچھ تیج لیئے آتے ہیں کہ اس کے آگے میں میں کی رٹ لگانے والے بے بس ہو جاتے ہیں۔ کچھ عورتوں کا حُسن بھی ہمیں مسحور کر دیتا ہے۔ اُن کے سامنے ہم چھوٹے

چھوٹے سے طفل کی مانند ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے۔نندا میں یہ جادو تھا۔ مجھے یاد آتا ہے ہمارے پرنسپل صاحب بھی جیم خانہ کمیٹی کی میٹینگ میں نندا کی باتیں بغور سُنتے تھے۔وہاں بھی نندااس طرح ٹوٹے ٹوٹے جملے کہا کرتا تھا ، لیکن انگلش میں ! تین چار لفظوں سے زیادہ بڑا جملہ نہ ہوتا تھا۔اُس دن بھی ہمیں جانا ہے، اتنا ہی کہہ دیا تھا۔میں نے ''کہاں! '' کہنے پر'' اِندو ویلنکر'' اُس نے جواب دیا۔

'' اندوویلنکر ''

'' مبارک باد دینے ''

'' اُس کے گھر؟ارے اس کا بوڑھا، بہت عجیب قسم کا ہے کہتے ہیں؟''

'' رہنے دے ! میں بھی ہوں چل ''

''ٹھیک ہے،توذرا گیلیر ی میں کھڑارہ، میں کپڑے بدلتا ہوں'' ہمارے محلے میں کئی ایک دشواریاں تھیں۔

'' پھرمیں باہر کس لئے ؟''

اس آٹھ بائے چھ کے ڈربے میں کونے میں مجھ سے جتنا ممکن تھا منہ پھرائے میرا اکلوتا پائجامہ پہن لیا،اُس میں شرٹ ٹھوس دیااورنکل پڑے ہم۔اِندوویلنکر کا واڑااس کی انگلش کے علاوہ اس کی ہر چیز کے لیئے موزوں تھا۔گلی کے منہ کے پاس ''قلعی والے پینڈ سے اندر رہتے ہیں'' ایسا ایک سیدھی انگلی سے اِشارہ کرتے ہوئے ہاتھ نکالا ہوا بورڈ تھا۔نیچے کسی پونے والی گلیوں کے پروردہ ابلیس لڑکے نے چاک سے '' لیکن قلعی راستے میں بیٹھ کر کرتے ہیں '' لکھ دیا تھا۔کچھ لوگ کہاں رہتے ہیں یہ بلاوجہ ہی ہمیں معلوم رہتا ہے۔اِندوویلنکر اس کی ایک مثال۔ایک بار کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ قلعی والے پینڈ سے کی گلی میں اِندو رہتی ہے۔اسی گلی سے میں گزرتے وقت دہلیز اور سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی عورتیں اور بچے گردن موڑ کر نندا کی طرف دیکھ رہے تھے۔اتنے خوبصورت مرد کے پاؤں کبھی اس گلی کو لگے نہ ہوں گے ! بستی سے جب پربھو رامچند رجائے سزا کی طرف جارہے ہوں گے تب بھیل قوم کی عورتوں نے اُنھیں اسی نظر سے دیکھا ہوگا ۔گلی ختم ہوتے ہوتے ج۔گو۔ویلنکر،ری۔اے۔انسپکٹرایسی ایک تختی نظر آئی ۔ہم اندر گئے۔دروازے کے باہر ایک رسّی لٹک رہی تھی رسّی کھینچئے ایسی ہدایت درج تھی ۔اُس مطابق ہم نے وہ کھینچی ۔پھر اندر کی جانب کہیں

بھی کچھ کھڑ کھڑایا اور کنڈی کھل گئی۔ایک بہت ہی معمولی سے چہرے والے پینشن یافتہ شخص نے پیشانی پر چشمہ رکھکر بل چڑھاتے ہوئے پوچھا،

'' کیا چاہیے؟ ''

''اندوتائی ویلنکر یہیں رہتی ہیں نا؟'' میں نے فوراً '' اندو '' کوتائی جوڑ کر اپنی نیک نیتی واضح کر دی۔

'' رہتی ہیں آپ ؟ '' یہ بھی بوڑھا نندا کی طرح توڑ توڑ کر بول رہا تھا۔

'' ہم اِن کے کلاس کے ساتھی ہیں۔ ''

اِتنے میں خود اِندو نے جھانکا۔نندا کو دیکھکر وہ بے حد تعجب میں پڑ گئی تھی اور اسے دیکھکر میں متعجب ہو گیا تھا۔ کالج میں کاکو کی طرح نوگز کی ساڑی پہن کر انبوڑہ ڈالنے والی اِندو گھر میں پانچ گز کی ساڑی میں ملبوس تھی۔ اُس کی چوٹی گھٹنوں تک آئی ہوئی تھی۔ بالوں میں پھول ٹانکے ہوئے تھے۔

'' آیئے آیئے .... تاتیا یہ بھی میرے ساتھ آنرس میں تھے۔ ''

'' پھر مل گیا کیا ؟ ''

'' ہاں ! ہم دونوں کو بھی مل گیا '' میں نے فوراً کہہ ڈالا۔ورنہ '' باہر نکل جایئے ''بوڑھا کہہ دیگا۔

'' بیٹھیے .... بیٹھیے نا آپ ''۔اِندو نندا کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے کہہ رہی تھی۔اِتنی بوکھلا گئی تھی ، اتنی گھبرا گئی تھی ،اوراس وجہ سے کیا کون جانے ، لمحہ لمحہ وہ زیادہ ہی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔نندا البتہ اطمینان سے بیٹھا۔

ہارٹی ایسٹ کانگریچولیشن ! '' نندا اس شخص کو بھگوان نے کیا کیا دے رکھا تھا ! اُس بوڑھے شخص کے دیوان خانے میں ایک وکٹورین کرسی پر بیٹھے نندا نے اس ٹھاٹ سے یہ الفاظ ادا کیے کہ مجھے لگا کہ اگر وہ بوڑھا نہ ہوتا تو اُس کے صرف اِتنا کہنے پر اِندو گلے لپٹ کر فرطِ خوشی سے رو پڑتی۔

'' تھے......نکیو .... '' سوکھے ہوئے تھرائے ہونٹوں سے اس نے کہا۔

'' آج رات کھانے پر آئیں گے کیا ؟ ''نندا پوچھ رہا تھا۔

'' کون میں ؟ ''اِندو کی آواز اتنی نرم تھی کہ مجھے خواہ مخواہ گالوں پہ پر پھرانے جیسا لگا۔

''میں نے ڈنر ارینج کر دیا ہے''

''ڈنر!'' تیل نہ ڈالی ہوئی جھولے کی کڑیاں جس طرح آواز کرتی ہیں ایسی کر کر کرتی آواز میں بوڑھے نے کہا۔

''یس سر! ٹوسلیبریٹ یُور ڈائرس سکسیس''۔

''کہاں ارینج کیا ہے ڈنر؟''۔

مور ینور میں!''

''ہائیل میں کیا؟ گھر نہیں ہے کیا آپ کے لیئے؟'' خود کے سر پر کا ایرنڈی کا پتا زوروں سے تھاپ کر بولا۔

''نہیں!''۔

نندا کا ''نہیں'' میرا کلیجہ چیر گیا۔ نندا کا گھر نہیں یہ کالج کے بہت ہی تھوڑے لوگوں کو معلوم تھا۔ اندو کے چہرے کی طرف مجھ سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ رات کو میں اور نندا مور ینور میں کھانے کے لیئے گئے تھے۔ نندا دروازے ہی میں میرا انتظار کرتے کھڑا تھا۔ مور ینور میں نندا کے اصرار پر کبھی کبھار میرے قدم لگ جاتے تھے۔ مجھے جھجک محسوس ہوتی ایک معمولی سے مراٹھا روزنامے میں تاروں کے تراجم کرنے کی معاونی ادارت کبھی کبھار ہٹلر، چرچل وغیرہ پر مدیران کو بالکل سُستی آجائے تو چار سمجھداری کی باتیں بتانے والے اداریئے لکھنا، اِن کاموں کے عوض مجھے ملنے والے کُل تیس روپیوں میں مجھے اُسے ''لکی'' میں مدعو کرنے کی حیثیت نہیں تھی۔ لیکن نندا ''آج آٹھ بجے مور ینور میں'' ایسا فوجی حُکم کی طرح دعوت دیا کرتا اور میں ہپناٹائیز شخص کی طرح جایا کرتا۔ آج نندا خوبصورت سوٹ پہنے کھڑا تھا۔ آزو بازو سے آنے جانے والے صاحب لوگوں کے میلے میں وہ اُنھیں میں سے ایک لگتا۔ انگریزوں نے اُس کے آٹھ دس سال بعد یہ دیش چھوڑ دیا، اس سے قبل کیمپ میں جاتے ہوئے یوں ہی ڈر سا لگ جاتا۔

''آگیا!۔۔ آ!'' اس کے مندر سپتک سروں میں اس نے خوش آمدید کہا۔ ''چل!''

جسم بچاتے میں ٹیبل کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ اتنے میں ایک پارسی لڑکی نے نندا کو ٹیبل پر کہنی ٹیک کر اپنے گورے گورے چولائی کی پھلی کی طرح نازک انگلیوں سے ''وِش'' کیا۔ نندا بھی ہاتھ اُٹھا کر اُسے قبول

کیا۔ اُسے یہ با آسانی کرنے آتا تھا۔ میں تو اُس موریؤ میں، صاحب ملک میں تھے اس وقت تک، کبھی سیر ہو کر کھانا کھا نہ سکا۔ نندا کا وہاں کا معمول تھا۔ اُس ہائیل کے پچھواڑے شانت بیلوں کا منڈپ تھا۔ وہاں ایک کونے میں ایک مخصوص ٹیبل اُسے ملا کرتا۔ ہم اس جانب جانے لگے۔۔ اور قریب سے بُرے پروِسکی کے کھنکنے والے پیالے لیکر جانے والے ویٹر کو دھکا لگ کر ہونے والا حادثہ آدھے انچ سے ٹل گیا۔ اُس ٹیبل کے پاس اندو ویلنٹر بیٹھی تھی۔ رنگ برنگی اسکرٹ میں گوری خواتین ! کالا سوٹ اور کڑ کتی کالر کا سفید شرٹ پہنے ہوئے وہ سُرخ صاحب ! اُن میں نہ جچنے والے ہم دونوں ہی تھے۔ میں اور لیموں رنگ کی ساڑی پہنی ہوئی اندو ! لیکن اُن ولایتی پھولوں میں وہ کیتکی جیسی لگی مجھے۔

''یہ گھبراتا ہے''۔ نندا نے کہا۔

کس لیئے ؟'' اندو نے پوچھا۔

وہ اتنی بے تکلفی سے بول رہی تھی کہ ، دوپہر قلعی والے پینڈسے کی گلی میں پیش آیا واقعہ حقیقت تھا یا خواب۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا ! یا یہ خواب ؟

''اس ہائیل سے گھبراتا ہے''۔

''اپنے سے اس صاحبوں کے ہوٹل کا کھانا نہیں کھایا جاتا !''۔

میرے ان الفاظ پر اندو ہنس پڑی۔ دو سالوں تک ایک کلاس میں بیٹھے ہم، لیکن اندو کے گال پر گڑھے پڑتے ہیں، وہ پہلی بار میں نے دیکھا۔ کتابوں کا بوجھ اور پلّو سنبھال کے کلاس میں داخل ہو کر پروفیسروں کے منہ سے نکلنے والے ایک ایک جملے نوٹ کرنے والی یہی اندو کیا میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

''کیا لینگی ؟'' نندا نے اندو کے ہاتھ میں مینو تھما دیا۔

''انھیں کیا چاہیئے وہ پوچھ۔۔۔ '' اندو وہ کارڈ میرے ہاتھوں میں دیتے ہوئے بولی۔

میں اس کے ''پوچھ'' اس ایک حرفی تخاطب پر مجروح ہوا اور دیوانہ وار نندا کی جانب دیکھتے ہی رہ گیا اتنے میں اندو نے وہ کارڈ میرے ہاتھ سے لیا اور بالکل اطمینان سے کھانوں کی فہرست کھولی۔

''خوبصورت لگتی ہو آج !'' نندا نے کہہ دیا اور مجھے بلا وجہ چکرانے جیسا محسوس ہونے لگا۔ میرا سینہ دھڑک

رہا تھا۔ دھنا جی کا گھوڑا کہتے ہیں مسلمانوں کو پانی میں نظر آتا۔ مجھے سامنے کے ٹماٹر سوپ میں اندو کا بوڑھا نظر آنے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ نندا کالج کی کس لڑکی کے ساتھ کہاں گیا تھا اس کی تفصیل ہم سارے دوستوں کو معلوم رہتی۔ یوں بھی ہم نے فرسٹ ایئر کی ریوتیا لمیاڈی نام کی بیحد خوبصورت لڑکی کے ساتھ اس کا نام طے کر رکھا تھا۔ کل اگر میں نے اپنے دیگر دوستوں کو نندا اور اندو ولینکر یہ نام جوڑ کر بتا دیا ہوتا تو اُنھوں نے تفتیش کے بغیر مجھے ایروڑا بھیج دیا ہوتا۔ لیکن یہ میرا آنکھوں دیکھا واقعہ تھا۔

پس منظر سے سنگیت کے سُر آرہے تھے۔ مخالف سمت کے ٹیبل سے وسکی کی بُو آرہی تھی۔ ٹیبل کے قریب سے گزرنے والی اِسکرٹ میں نوجوان لڑکیوں کی جانب سے جان لیوا ولایتی خوشبو کا فوارہ جسم سے ریشمی کپڑے کھینچ لینے کی طرح سرک رہا تھا۔ ہو بہو مدن کی طرح دکھائی دینے والا نندا میرے بائیں جانب تھا اور سامنے اِندو ولینکر کسی جادو سے پری بن کر آگے آکر بیٹھی تھی۔

یہ منظر کسی ماہر مصوّر کی تصویر کی طرح اُبھر کر آیا تھا۔ اس رات میں ان کو کیمپ میں چھوڑ کر آگے بڑھا اس رات کی چاندنی ان دونوں کے جسم پر برستے وقت خود کی زندگی کا مقصد پورا ہونے کا احساس ہوا ہوگا۔ سنڈریلا کی کہانی میں کسی یکشبنی نے اسے سنوارا تھا۔ یہاں اِندو کا ہاتھ ظاہراً ایک یکش کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن یکش کو بدُعا رہتی ہے ایسا کہتے ہیں۔ اس رات کے بعد ان دونوں کو بھی کسی کی نظر لگ گئی۔ ایشور جانے ! مجھے کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ بی۔اے، پر تعلیم ختم کر کے نوکری کی تلاش میں میں بمبئی آیا اور ایک دفتر سے منسلک ہو گیا۔

''دیکھ کیا رہا ہے ؟'' نندا کے اس انداز میں تخاطب سے میں ایکدم چونک اُٹھا۔ دِل کی رفتار کتنی تیز ہوتی ہے۔ لمحے بھر میں کتنی سیر کر آیا۔ نندا میرے سامنے کھڑا ہے اِس بات پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ اِنگلینڈ چلا گیا اور وہیں کا ہو کر رہ گیا ، اتنا ہی مجھے علم تھا۔ کھویا ہوا کھلونا ملنے کے بعد جیسی ایک بچّے کی حالت ہوتی ہے ویسی میری ہو گئی تھی۔

''نندا'' میں پاگلوں کی طرح چلّایا۔ جان کس طرح آدھی ہو جاتی ہے اس کا احساس مجھے اس وقت ہوا۔ چہرے پر چالیس سال بیت جانے کے آثار واضح طور پر دکھائی دے رہے تھے۔ کالی ٹیریلن کی پتلون

اور سفید بش شرٹ پہنے وہ سامنے کھڑا تھا۔ بش شرٹ پر کسی قسم کی ڈیزائن تھے۔ وہ اس کی نیلی آنکھیں بالکل ویسی ہی تھیں۔ چہرے پر صابن کی نئی ٹکیہ کی تازگی تھی۔

'' کب آیا ہندوستان میں ؟ ''

''کب کا ! چل ''

کسی جادوگر کے پیچھے چلیں اس طرح کے پیچھے چلا گیا۔ '' وے سائڈ ان '' میں ہم داخل ہوئے۔ گزشتہ کئی سالوں سے اس ہوٹل میں جا کر چائے پینے کا پلان بنا رہا تھا۔

'' کہہ ! '' ایسے معمول کے انداز میں نندا نے کہا جیسے ہم روزانہ ملا کرتے تھے۔ مجھ میں بلاوجہ خوشی کا اُبال آ رہا تھا اور یہ نیک بخت بالکل شانت تھا۔

'' میں کیا کہوں ؟ تو ہی بول۔ کتنے سالوں بعد ملے ہم ! نندا مجھے لگا کہ تو انگلینڈ میں بس گیا '' مجھے بس گیا '' یہ لفظ کچھ عجیب سا لگا۔ یہ لفظ پونہ وغیرہ میں مستقل رہنے والوں کے لئے ٹھیک ہے۔ لیکن انگلینڈ میں '' بس جانا ''

کس لئے مجھے ''سیٹل '' کہنا چاہیئے تھا۔

'' چھے ! انگلینڈ میں کیا ہے '' اب تک اس کے وہ تین تین لفظوں کے بول برقرار تھے۔ آواز بھی ویسی ہی ،سیدھا ہاتھ سر کے پیچھے پھرانے کا طور بھی وہی۔

'' مجھے کیا پتہ ! تو ہی کہہ دے۔ اتنے سال کیا ،کیا انگلینڈ میں ؟ سترہ اٹھارہ سال بیت گئے۔ ایک جنگ عظیم ہو گزری۔ آزادی حاصل ہوئی ۔ ''

'' کسے ! '' ۔

'' بھارت کو !''

او آئی سی۔ ہاں حاصل ہوئی !'' ٹو ٹیز '' یہ ویٹر کے لیئے حکم تھا ۔

بیچ بیچ میں کسی ندیدہ کی طرح دیکھ رہا تھا ۔

'' موٹا ہو گیا تو '' نندا نے کہا۔

''تو البتہ تھا ویسا ہی ہے۔ایسا لگتا ہے ہم نے کل ہی بی۔اے پاس کیا ہے۔کچھ یاد آرہا ہے تجھے !باقی تجھے کیوں یاد آئیگا وہ بھٹ جی پونے۔۔لندن میں رہا اتنے سال۔لندن میں ہی تھا کیا رے!''

''نہیں،کئی جگہوں پر تھا ''۔

''پیرس دیکھا ہوگا نا!'' یہ سوال کرنے پر مجھے باولے پن کا دھیان آیا ۔

''دیکھ لیا ''۔نندا کے ذہن میں میری لاعلمی نہیں آئی ہوگی ۔

''اور کیا دیکھا ؟''

''خوب دیکھا''۔

''نصیب والا ہے بابا!میرے اس فقرے پر کسی چھوٹے بچّے کے بچکانا باتوں پر ہنسیں اس طرح ہنس پڑا ۔

''کیوں رے ہنسا؟ میں دیکھ گزشتہ اٹھارہ سالوں سے اس بمبئی میں ہوں''۔میں اور دفتر !اتوار بستر پر آرام کرتے گزارتا ہوں۔بھاگ دوڑ میں دادر میں اچھّی جگہ تھی وہ چھوڑ کر ڈومبیو لی چلا گیا۔وہاں سے آتا ہوں روزانہ''۔

''کیسی بھاگ دوڑ ''۔

''ارے جنگ میں بم گرنے کے خطرے سے لوگ بھاگے نہیں کیا ؟''۔

''اوآئی سی !پھر ہوا کیا بم کا حملہ ؟''۔

''نہیں رے !تجھے کسی بات کا علم نہیں ایسا لگتا ہے۔باقی تو نے البتہ خوب بم کے حملے دیکھے ہوں گے نا؟ بچ گیا،سچ مچ ۔ایشور کے دل میں اپنی ملاقات کرانی تھی''۔

''کس کے من میں؟''

''ایشور کے!اور کس کے؟''

''اوآئی سی !''

میری یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اتنے سالوں بعد ملا ہوا یہ دوست میرا کہا ہوا ریڈیو کی خبروں کی طرح ادھوری ادھوری کیا سُن رہا ہے !۔

''وہ مرنے دے ۔۔تیرا کیا ہوا وہ بتا !''

''اچھا چل رہا ہے''اس نے کہا ۔

میرے من میں دراصل اس سے پوچھنا تھا شادی وغیرہ کی باتیں ۔لیکن ہمت نہیں ہو رہی تھی ۔ مجھے اس خالی کرسی پر اچانک اندو ویلنکر نظر آنے لگی ۔ سچ کہا جائے تو نندا کی ملاقات ہونے تک اندو کی یاد اتنے سالوں میں کبھی آئی نہیں تھی ۔ڈومبولی تا ممبئی کے سفر میں ایسی یادوں کے لیئے کہاں گنجائش؟

''کہاں رہتا ہے!''میں نے نندا سے پوچھا ۔

''تاج میں ''

''باپ رے !'' میرے منہ سے فوراً یہ لفظ نکل پڑے ۔تاج محل ہاٹیل کے آس پاس گھومنے کی تک میری حیثیت نہیں تھی ۔

''کیوں رے!''

''ارے، کتنے مہنگے ہوٹل میں یہ! دن میں پندرہ سولہ روپیے پڑتے ہیں نا !''

''فی کس پینتالیس روپئے !''

ایک کے لیئے پینتالیس روپئے ۔ یہ عدد سننے کے بعد اس کے ساتھ دوسرا کوئی ہے کیا یہ شبہ زور پکڑ گیا ۔لیکن پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی ۔

''نندا، باقی اتنے سالوں میں تو پہچان نہیں بھولا یہ سچ مچ تعجب کی بات ہے۔ تیرے لحاظ سے ہم یعنی ۔۔!''

''کہاں نوکری کرتا ہے ؟''

پھر میں نے اسے اپنے دفتر کا پتہ بتا دیا۔ اس نے ٹیلی فون نمبر لکھ لیا اور اس کے بعد اس کے مجھے فون آنے لگے ۔ٹیلی فون پر بھی مجھے وہ ''شام کو آتا ہوں گیٹ کے پاس کھڑا رہ''

اتنا کہہ کر گاڑی لیکر آتا اور پھر ہم سیر کرنے جاتے ۔ مجھے بار ہا لگتا کہ اُسے گھر پر مدعو کروں ۔لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس اپنے ڈومبولی کے گندے گھر میں مدعو کرنے میں شرمندگی محسوس ہو رہی تھی میں نے اسے کبھی بلایا نہیں لیکن نندا نے میری پہچان رکھی اس کا مجھے بے حد اطمینان تھا۔ ہم بار بار ملتے رہے اور ہوتے ہوتے وہ

نندا جسے میں کبھی دیکھ نہ پایا تھا وہ نظر آنے لگا ۔

وہ پانچ سال کا تھا تب اس کی ماں نے طلاق لیکر ایک لکھ پتی شخص سے بیاہ کیا تھا۔ اس کے والد بیرسٹر تھے۔ نندا کے قابلِ سمجھ ہونے کے بعد سے اُس نے اُنھیں کبھی ہوش کے عالم میں نہیں پایا تھا۔ پانچ سال کی عمر میں وہ ایک پبلک اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں گیا اور اس کے بعد سے آج تک گھر کیا ہوتا ہے یہ اس نے دیکھا تک نہیں تھا۔ اُس کے والد کی بہت بڑی جائداد تھی ۔ کئی ایک چالیں تھیں ، بنگلے تھے ، ملوں میں شئیرس تھے۔

ایک بار ہم باندرہ پائنٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ نندا کو یہ جگہ بہت پسند تھی ۔ میرے کچھ نہ پوچھنے پر بھی نندا کہنے لگا ۔ بڑی دیر تک وہ پارسی کے بھرے بھرے بچّے کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ وہ چار پانچ سال کا لڑکا اور اس کا باپ سمندر میں پتھر پھینک رہے تھے۔ کتنی دیر تک نندا باپ بیٹے کا کھیل دیکھنے میں محو رہا۔ اور یکا یک وہ بولنے لگا ۔ ناٹک میں منہ ہی منہ میں کچھ کہتے ہیں اُس طرح ۔ ریڈیو جسطرح سامعین کی فکر نہ کرتے بولتا ہے اس طرح ۔ وہ بولنا کسی کے لیئے نہیں تھا ۔

''میں اپنے والد کے ساتھ ایسے ہی پتھر پھینکا کرتا تھا۔ وہ اوپر بنگلہ نظر آرہا ہے نا؟ ہل پر؟ وہ ہمارا گھر تھا۔ میں نے اوپر کی جانب دیکھا ۔ جھاڑی سے ایک رجواڑے کا کونا نظر آرہا تھا۔ اُس پار ماؤنٹ میری کا چرچ نظر آرہا تھا۔

''چلیئے اُوپر چلتے ہیں ''۔

پھر میں خاموشی سے اُس کے پیچھے چڑھان چڑھنے لگا۔ اس راستے کے دونوں جانب خوبصورت باغ ہیں عالیشان بنگلے ہیں۔ ممبئ میں اتنے سال رہنے کے باوجود میں وہ حصّہ کبھی نہیں دیکھا تھا ۔ جس حصّے میں سیر کرنے کے لیئے بھی شاید پیسے درکار ہوں یہ ڈر ہو اُس حصّے کی معلومات مجھے کیسے رہیگی ! پارسیوں اور خوجا لوگوں کے بھرے بھرے بچّے اور بیچ ہی میں جوانی سے اٹھلاتی کوئی فراک پہنے لڑکی نظر آتی ۔ لڑکے شور وغل کرتے اُتر رہے تھے ۔ ہم دونوں چرچ کی جانب اوپر جارہے تھے ۔ نندا آس پاس کچھ پہچان کی نشانیاں تلاش کرتا ہوا یاد دیکھتے دیکھتے چل رہا تھا ۔

''تجھے کچھ یاد آ رہا ہے کیا رے بچپن کا ؟''

''وہی دیکھ رہا ہوں ''۔ایک گھر کے باب کی تختی دیکھتے ہوئے وہ بولا ۔''لیں، اٹ از دئیر!''

''کیا وہ؟''

''جھولا! ہنڈولہ۔ یہاں میں جھولتا رہتا تھا۔ شیرین نام کی لڑکی تھی وہ ہمارے بنگلے پر آیا کرتی تھی۔ لیں۔ اب تک وہ لوگ رہتے ہیں یہاں !''

اتنے میں اس جھولے کی طرف ایک چار پانچ سال کی لڑکی دوڑتی ہوئی گئی ۔

''تیری شیرین کی لڑکی ہوگی ''۔ میں زیادہ دیر تک شعری ماحول میں نہیں رہ سکتا۔

نہیں!''

''کس پر سے !''

''میں آخری سال گھر آیا۔ آٹھ سال کا تھا۔ چھٹی میں آیا ہوا تھا۔ شیرین کو ٹائفائیڈ ہوا اور وہ انتقال کر گئی''۔

''اتنا یاد آ رہا ہے تجھے؟''

''ٹائفائیڈ'' یہ لفظ اس وقت سے میرے ذہن میں ہے۔ اُس کے بعد کئی سالوں تک آدمی کی موت کے وقت اُسے ٹائیفائیڈ ہوتا ہے ایسا لگتا تھا! فنی!'' یہ کہتے ہوئے نندا جھولے پر کی لڑکی کی طرف ٹک لگائے دیکھ رہا تھا۔ ''پر ہوگی اُسی فیملی سے ''۔

''کس پر سے ؟''

''اُس کی آنکھیں اور بال!''

''کیا !''

یہ فضل بھائی فیملی کی ٹریٹ ہے''

چلیں کیا اندر ؟ تیری پہچان کا کوئی تو ہوگا ''۔

''ہے نا''۔

''کون ہے''۔

"میری ماں !"

میں چکرا کر نیچے کیسے نہ گرا اس کا مجھے تعجب ہے۔ نندا کی ماں نے اُس کے باپ سے طلاق لے کر اُس بنگلے میں دوسرا گھر بسایا تھا۔

"آگے چل"۔

پھر کچھ دیر خاموش رہ کر ہم آگے بڑھے۔ یہ ہمارا گھر" برآمدے سے ایک السیشین کُتا بھونکنے لگا۔" ہے یو "گولڈی،، گولڈی!" ایسا پکارتے ہوئے ایک یوروپین خاتون نے اُس کتے کو قابو میں کر لیا اور ہماری جانب کچھ شبہہ کی نظر سے دیکھا۔

"بہت اچھا ہے کتا تمھارا !"

نندا کی صاف ستھری انگریزی سُن کر یا اس کی چالیس سال عمر میں بھی نہ ڈھلتی خوبصورتی دیکھ کر، کون جانے وہ عورت خوش ہوگئی اور پھر اُس نے پانچ منٹ اُسے سہلایا۔ نندا اتنے میں باغ دیکھنے لگا بنگلہ پرانی طرز کا تھا۔ برآمدے میں چاروں جانب کٹھرا تھا اور اس کے لوہے کی بیل بوٹوں پر انگریزی میں 'پی

"اب کس کی ملکیت ہے یہ؟"

"معلوم نہیں۔ والد نے بیچ دیا لگتا ہے "۔

"تیرے والد کہاں رہتے ہیں رے ؟" مجھے لطف آیا۔ بیس سال کی رفاقت میں یہ سوال آج پہلی مرتبہ میں نے اُس سے پوچھا تھا۔

"دیکھنا ہے؟"

میرے ہاں کہنے سے پہلے ہی وہ مجھے چرچ کے پاس لے گیا، اُس چرچ کے پچھواڑے کرشچن قبرستان تھا۔ وہاں قبروں کے درمیان سے راستہ نکالتے ہم آگے آگئے۔ ایک قبر پر اُس کے والد کا نام تھا ! مُکتی دن کا انتظار کرتے وہ بیٹھے تھے ۔ نندا مذہب سے کرشچن ہے اس کا مجھے علم نہ تھا۔

"تیرا کرشچن مذہب ہے یہ مجھے معلوم نہ تھا "۔

"میرا ! چھی چھی ، والد کا !"

''پر والدین کا مذہب وہی بچّوں کا نہیں کیا؟''

''ماں نے اسلام قبول کیا ۔والد نے مرتے وقت عیسائی مذہب قبول کیا۔ اُنھوں نے ایک امریکن خاتون سے شادی کر لی تھی''۔میرے لیئے یہ نا قابلِ برداشت ہونے لگا تھا ۔میری ایک ماموں زاد بہن ہے سب کاسٹ نوجوان سے شادی کر لی تھی اُس وقت ہمارے خاندان میں کیا غضب برپا ہوا تھا !اب بھی جب کبھی وہ آتی ہے تب کوئی بہادر لڑکی یا بیہودہ خاندان کو ڈبونے والی آئی ہے ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں۔اور یہاں نندا اطمینان سے مجھے بجلی کے جھٹکے دے رہا تھا ۔

نندا کی ماں نے گھر چھوڑنے کے بعد اس کے والد نے شراب شروع کر دی۔ جائداد''کورٹ آف وارڈس'' کے پاس تھی اور نندا بالغ ہونے تک اس کی دیکھ بھال کورٹ کے وہ سخت مزاج افراد کر رہے تھے ۔''گھر'' نام کے ادارے کا اور اس کا تعلق آٹھویں سال دائمی طور پر ختم ہوا ! ۔

''ڈیڈی مجھے نیچے کندھے پر اُٹھائے لیجاتے !''

اس قبر کی طرف دیکھتے ہوئے نندا مجھے بتا رہا تھا اور ہم سمندر میں پتھر پھینکتے تھے۔''ہی واز اے نائس سول'' نندا نے یہ جملہ کہتے ہوئے اُس قبر پر سے کچھ اس طرح ہاتھ پھرایا کہ میرے جسم میں رونگٹے کھڑے ہو گئے ایسے پس منظر میں پلا ہوا یہ نندا میرے ساتھ اُس دن قلعی والے پنڈسے کی گلی میں آیا تھا اور ایڑ ندی کے پتے سے سر ٹھنڈا کرنے والے اُس ویلنکر بوڑھے نے اُس کی کتنی بے عزتی کی تھی۔

روز بروز مجھے نندا نام کا سایۂ خوبرو منڈلاتا ہے ایسا محسوس ہونے لگا۔ میرا اور اس کا پچھلے جنم کا احسانات کا بندھن تھا، خدا جانے۔وہ ہفتے میں بالکل سنیچر کو فون کر کے مجھے باہر نکالتا۔ میں اس کے تاج محل میں البتہ کبھی نہیں گیا تھا۔ وہ دفتر کے دروازے پر گاڑی لیکر آتا۔ ساتھ کے کلرکوں کو چھوڑ کر جانے میں مجھے بڑی ہچکچاہٹ ہوتی۔ کئی بار دفتر میں ''کون وہ تمھارا پارسی دوست'' ایسی پوچھ تاچھ بھی ہوئی تھی۔ میں نے ''کالج کا پرانا دوست ہے'' اس سے زیادہ ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا ۔شراون کے دن، سنیچر، سائی بابا، راشی، خاندانی رسمیں نبھانے والے ہمارے اس سرکاری دفتر کے نپے تُلے ماحول میں، اچار کے شیشی جیسے جگ میں، اگر میں نے نندا کی کہانی سنائی ہوتی تو نندا کے بیٹھے ہوئے دفتر کی کرسی پر لوگوں نے ''گومتر'' چھڑکا ہوتا۔ کبھی کبھار

میں گیٹ تک نہ گیا تو وہ اندر آتا اور ہمارے اس فائیلوں سے گھرے سیکشن سے اسے کب باہر نکال لاؤں ایسا مجھے لگتا۔

اتنے دنوں تک اندو ویلینکر کا ذکر بڑی چالا کی سے ٹالا تھا۔ ننداکا بولنے کا انداز، زندگی کی جسم پر رونگٹے کھڑے کر دینے والے تجربات تک ایک ایک کر کے خوبی سے بیان کرنے کا طریقہ مجھے معلوم تھا۔
ایک بار میرے ہاتھ میں ایک مراٹھی ناول تھا۔
'' دیکھوں! کئی سالوں سے میں نے مراٹھی کتاب ہی نہیں دیکھی ہے۔'' اس کے ابتدائی جماعت کے بچے جیسے ایک ایک حرف جوڑ کر پڑھتے ہیں اس طرح اس نے ناول کا نام پڑھا ۔''تی ۔۔۔۔ملا ۔۔۔۔منہالی
(اس نے مجھ سے کہا) ۔او، آئی سی، کیا کہا !''
''ارے کیا کہے گی !میرا پیار ہے تجھ پر ،ایسا کہا ''۔
''اچھا ہے کیا ناول !''
'' کچھ حد تک! کچھ نہ کچھ پڑھنے کے لیئے چاہیئے''۔ میں نے خواہ مخواہ ہی دفع میں بات کی۔
''پریم کیا کیا !ہلی! کتنی عورتیں دیکھی ہیں اس نے؟''۔
وہ شام لیکن میں زندگی میں بھولنے والا نہیں ۔نندا بم کے حملوں میں لندن میں رہتا تھا ۔انڈر گراؤنڈ ریلوے کے بینچوں پر آ کر لوگ زندگی بچانے کے لیئے رات بتاتے تھے ۔
موت کے منہ سے نکل کر لوگ ایک دوسرے سے لپٹ کر چونٹیوں کی طرح سوتے تھے۔ اس وقت ہر لمحہ آخری لمحہ تھا۔ کوئی بھی کس کی بھی بانہوں میں اس وقت صرف خوف مٹانے کی غرض سے اطمینان کے لیئے گھل مل جاتے۔ وہاں کا ملاپ بلا خواہشات تھا۔ وہاں خوف کے علاوہ دوسری کوئی خواہش نہیں جاگتی تھی۔ دھرم، نیتی، خلوص، اعتقاد ایسے الفاظ غیر مروّجہ سکّوں کی طرح کاغذ کے پُرزے بن کر گٹر میں گر گئے تھے ایسے وقت میں نندا جس کا دنیا میں کوئی بھی نہیں ہو، ویسے موت کے منہ میں پھنسے قریب المرگ لوگوں کا منظر، ناٹک دیکھنے کی طرح دیکھتے گھوم رہا تھا۔
''گھبرایا نہیں تھا !''۔

''گھبرانے سے پرے ایک عجیب سا جذبہ ہوتا ہے۔ گھبراہٹ کے لیئے بھی ایک'' ہم زندہ ہیں تو زندہ رہنے والے ہیں'' ایسے سہارے کی ضرورت پڑتی ہے۔ پُل پر پاؤں کے نیچے لکڑے کا تختہ ہے نا اُس طرح ۔ سمجھ تختہ میں نے ہٹا لیا اور تُو تاریکی میں ہی چلنے لگا تو کیا ہوگا ؟ لاشوں کے انبار میں پہلی لاش کچل کر آگے بڑھنے تک خوف رہتا ہے پھر کچھ احساس نہیں ہوتا۔ ارے بازو میں کس کی ران پڑی ہے، ہاتھ گرا ہوا ہے، راستے کے دونوں جانب کے مکان ڈھیر ہو گئے ہیں۔ جو ادھورے کھڑے ہیں ان میں ایک آدھ پلنگ لٹکتا دکھائی دے رہا ہے، برف گر گر کر کیچڑ بن گئی ہے۔۔۔۔۔ ایسے ماحول میں بھی ایکبار لندن یونیورسٹی کا بوڑھا پروفیسر، میں اور بم گرنے سے تہس نہس ہوئے سامنے کے مکان کی ایک جوان لڑکی مل کر ہماری بحث چل رہی تھی ۔

''کیسی بحث!''۔

''ہنسنا مت ! دنیا میں پریم نام کی شئے ہے یا محض اس کی تصویر ہے ''۔ پروفیسر کہہ رہے تھے نہیں پریم ہے ، وہ لڑکی کہہ رہی تھی ، دنیا میں صرف پریم ہی ہے ۔ اس کا ایک جوان فوجی سے پیار تھا اور وہ ہندوستان میں تھا اس لیئے بہت خوش تھی۔ کیونکہ اُسے یقین تھا کہ وہاں جنگ نہیں ہے۔ اُسے شیر کھا جائے گا اُس سے وہ ڈرتی تھی ! مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ تم لوگوں کے پاس جادو ہوتی ہے نا ۔۔۔ شیر آنے پر اُسے واپس لوٹانے کی؟ پھر میں نے اُسے منتر بتایا اور کہا، یہ لکھ کر بھیج دے اپنے پریمی کو ! ''

''کیسا منتر !''

''اوہ اسٹوپڈ !'' رگھوپتی راگھو راجا رام ، اُسے میں نے یہ لکھ کر دے دیا اور کہہ دیا کہ ممبئ میں کہیں بھی شیر نظر آجائے تو یہ الفاظ بلند آواز سے پڑھنا ہیں ''۔

''ممبئ میں ؟''

''وہ ممبئ میں تھا کہتے ہیں ''۔

''بیچاری !''

''اُس لڑکی نے اپنے پاس کے آخری دو چاکلیٹ مجھے دے دیئے ''۔

''تُو نے لے لیئے ؟''

''نہیں میں نے اس سے کہا کہ ہندو دھرم میں جادو بتانے والے کو اس قسم کے تحفے لینے کی اجازت نہیں ہے''۔

''اور تیرا وہ مزاق بم حملوں میں بھی جاری تھا ؟''

''پھر کیا کیا جاتا ؟ ابتدا میں لوگ رو پڑے، چیخ اُٹھے۔ پھر پندرہ دنوں کے اندر سُست پڑ گئے''۔

''نندا ایک مفکر!''

''شادی کیوں نہیں کی؟ رائٹ!''

''ہاں!''

''کی تھی میں نے شادی ''

''کس سے ؟''

''اب ! تجھے کیا بتاؤں ؟ ایک لڑکی سے ''۔

''ایسا کیا ؟ مجھے لگا انگلینڈ میں صرف لڑکوں ہی کے بیاہ ہوتے ہیں !''

''پھر لڑکیوں سے بیاہ نہیں ہوتا تو کس سے ؟''

''ارے ،لیکن اس کا کوئی نام ،گاؤں ! ''

''اس کا نام تھا ۔ وِلما، اور گانو نہیں تھا ۔ صرف دیش تھا ،جرمنی !''

''جرمن لڑکی؟ پر تجھے جرمن زبان آتی ہے ؟''

''اس میں کیا مشکل ہے! لیکن اُسے انگریزی آتی تھی نا !''

''پھر ٹھیک ہے ''

''ہاں ! ٹھیک ہے۔۔ اور کوئی سوال ؟''

''خفا ہو گیا کیا بابا ؟''

''نہیں کر لے ۔۔ تیرا اگلا سوال کیوں ؟۔۔۔ فی الحال وہ کہاں ہے ؟''

''سچ مچ تجھے تکلیف ہو رہی ہو تو مت کہہ ۔ ہم کچھ اور بات کریں گے''۔

''ارے تکلیف کیسی ! میں برلن میں رہتا تھا۔ایک جرمن رنگ کے فرم میں کام کرتا تھا ۔وہاں وہ تھی۔''

''وہاں تمھیں پیار ہو گیا''۔

''کون جانے ! لیکن ہم نے شادی کی ۔ وہ جیو(یہودی) تھی ۔ پھر جنگ شروع ہوگئی ۔اس کے آگے کا حال جاننا چاہتے ہو''۔

''نہیں چاہیئے !''

''یکش کو بدعا رہتی ہے یہ میں نے پڑھا تھا۔البتہ اس یکش کو کتنی بدعائیں تھیں !

''پھر اس کے بعد تو نے شادی نہیں کی؟''

''ارے شادی کروانے کے لیئے ۔ بھٹ جی ، پادری ، قاضی ۔۔۔ کوئی تو جگہ پر موجود چاہیئے نا ! کوئی بھی نہ تھا۔ پھر خوب شادیاں رچائیں میں نے ۔ خوب پیار کیا ۔ اس میں کیا ؟ وہی جملے ۔۔ انگلش ،فرینچ ، جرمن زبان میں ادا کرتے ہیں اور سنتے ہیں ۔۔ تیرے اس ناول میں نہیں ہے کیا یہ !''

مجھے اس مراٹھی ناول پر ترس آیا۔خود کی بیوی کے ساتھ ''ایک یکم ایک ، ایک دوئی دو'' کرتا ہوا ہندو کالونی کی گلیوں کی طرف اپنی کھڑکی سے دیکھتے زندہ رہنے والا وہ پاپوں سے خائف ناول نگار صنفِ نازک کے بارے میں لکھ رہا تھا۔اور یہاں بم حملے میں آندھی میں اُڑنے والے پتوں کی طرح اُڑ کر آئی ہوئی انگنت عورتوں کو تصوّرات کی آنکھ سے دیکھا ہوا انسان تیرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔اس کی ماں پانچ سال کی عمر میں اُسے چھوڑ کر دوگھر پار کر کے اپنا سنسار چلا رہی تھی ۔ بیرسٹر باپ قبر میں شراب اور عورت کی سہولت کیوں نہیں اس بارے میں یومِ نجات کو اللہ کے سامنے اعمال کا حساب دیتے ہوئے کس سوال سے شروعات لی جائے اُس کی فکر میں بیٹھا تھا۔نندا نے ہلاہل کے گھونٹ سے ہی زندگی کا پہلا مزہ چکھا تھا۔کس لیئے تو سدا احتیاط سے رہنے والا میں اور ''احتیاط کرنے جیسا دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے کیا ؟'' ایسا سوال کرنے والا نندا ! بھگوان کی دنیا کی یہ ایک عجیب جوڑی بنی ہوئی تھی ۔فطرت بھی کیا حد مقرر کرتی ہے ! واہ ! ۔نندا نے زندہ رہنے کے لیئے کیا مشغلہ اختیار کیا اس کا مجھے علم نہ تھا۔اچھی خاصی بڑی موٹر گاڑی تھی ۔تاج میں رہتا تھا ۔ممکن ہے

والد کی بڑی جائداد ثابت رہی ہو ۔

ہم البتہ اب بڑے کھلے دل سے باتیں کرتے تھے۔لیکن وہ میرے ساتھ اتنا وقت کیوں بتاتا ہے وہ میرے لیئے معمہ تھا ۔ایک بار وہ مجھے اپنے تاج محل کے کمرے میں لے گیا ۔وہ ماحول دیکھ کر میں لگ بھگ تعجب میں پڑ گیا تھا ۔نندا لیکن اس عیش و آرام میں اطمینان گزارا کرتا تھا۔

''آج ہمیں ساتھ کھانا کھانا ہے''۔

''لیکن تیرے اس ہوٹل میں کھانے کا لباس پہننا پڑتا ہے''۔

''ڈونٹ وری!'' تو نے ہی کہا تھا کہ بھارت آزاد ہو گیا ہے! تیرا یہ لباس چل جائے گا۔ارے دھوتی کہیں بھی چلتی ہے !''

اور اس روز پہلی مرتبہ اِندو ویلنکر یہ موضوع چھڑ گیا۔بیس سال قبل اسی تاریخ کو ہم موریٹور میں کھانے کے لیئے گئے تھے۔میرے ذہن میں تاریخ نہیں تھی، نندا کے تھی۔

یہ یوگی شخص اپنی زمین سے اتنا جڑا ہوا ہوگا اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔

میں نے اُنھیں کیمپ میں چھوڑ دینے کے بعد کی پوری کہانی اس نے مجھے کہہ سنائی، جنگ کی بھڑکی ہوئی آگ میں اس کے وجود کا کئی بار خاتمہ ہوا تھا۔صرف ایک چیز برقرار تھی۔وہ اس نے اپنے پاکٹ سے نکال کر میرے سامنے رکھدی تھی۔ایک بہت ہی پرانا خط تھا ۔اندو کا اسے آیا ہوا خط !اندو نے اُس میں اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔میں نے صرف کتابوں ہی میں پیار کے خطوط پڑھے تھے۔یہ سچ مچ کا پیار تھا۔بیس سال پہلے کی اُس پر تاریخ تھی۔وہ خط پڑھتے پڑھتے میری آنکھوں سے آنسوؤں کی قطار لگ گئی۔

''اے پگلے روتا کیا ہے!''

نندا مجھے ہمّت دِلا رہا تھا ۔

یکا یک نندا مجھے باندرہ کی کھاڑی میں پتھر پھینکنے والے بچّے جتنا چھوٹا لگنے لگا۔میرے چھوٹے بچّوں کو میں پیار سے سہلاتا ہوں، پیٹھ تھپتھپاتا ہوں اُسے چومتا ہوں، اُس طرح اُسے کروں ایسا لگنے لگا۔لیکن کچھ بھی کر کے میں ایک کمزور کلرک تھا۔صرف میری آنکھوں نے یہ بندھن نہیں نبھائے۔آخر وہ خط اُس کے ہاتھ

میں دیکر میں نے کہا۔ ''نندا، دنیا میں بھگوان نہیں ہے رے!''

''ارے دنیا میں کچھ بھی نہیں ہے رے! جس وقت ہم سانس لیتے رہتے ہیں نا، اتنا لمحہ ہوتا ہے۔ وہ دیکھ، کھڑکی کے باہر سمندر دکھاتے ہوئے وہ بولا۔ ''وہ سمندر ہے نا؟ اس میں ہمیں کیا دکھائی دے رہا ہے؟ لہریں نظر آرہی ہیں، وہ جہاز نظر آرہے ہیں۔ وہ مچھیرے، دیکھ چھوٹی کشتی لئے نکل پڑے ہیں اُنھیں کیا دکھائی دیتا ہے؟ صرف مچھلیاں نظر آتی ہیں۔ وہ اور مچھلیاں ۔۔ اُن کے درمیان آنے والی رکاوٹ یعنی سمندر! جیون جسے کہا جاتا ہے نا وہ ہماری پیدائش سے ہماری موت تک وہ صرف اسی طرح آڑے آتے رہتا ہے۔ باقی کچھ بھی نہیں رہتا، کبھی وہ بڑی لہریں بن کر آتا ہے۔ آندھی بن کر آتا ہے۔ کبھی یونہی ہٹ دھرمی سے راستہ روکے پڑا رہتا ہے۔ پھر اکتاہٹ پیدا نہ ہو اس لیئے ہمیں لیبل چسپاں کرتے ہیں۔ پریم کہتے ہیں، بیوی کہتے ہیں، ماں کہتے ہیں، دھرم کہتے ہیں، دیو کہتے ہیں جو دل میں آئے وہ کہتے ہیں۔ ورنہ زندگی یہ بے وجہ دھوکا دینے والی شئے ہے۔ اس سمندر کی طرح!''

''ایسا کیوں کہتا ہے تو؟ اندو کی تجھے یاد آتی بھی ہے یا نہیں!''۔

''ارے، تو نے جس وقت کولی کا بڑا جال سمندر سے کھینچ کر نکالتے ہیں اُس وقت دیکھا؟ اُس جال میں پھنسی ہوئی مچھلیاں اُتنے سے وقت میں چھوٹی مچھلیوں کو ٹکڑے کر کے نکل جاتی ہیں۔ پُور سولس!''

''اندو نے تجھے کیوں انکار میں جواب دیا؟''

''وِلما کو ہٹلر کے فوجی میرے سامنے کیوں کھینچ کر لے گئے! چوہے سے بھی گھبرانے والی وِلما کیا ہٹلر کو کھانے والی تھی؟ تجھے دیکھ لینا چاہیئے تھا اُسے''۔

''فوٹو ہے اس کا!''

''ارے، کس کس کی تصویریں رکھوں؟ اور کس لیئے؟''

''پھر اندو کا خط کیوں رکھا؟''

''تجھے سچ بتاؤں۔۔۔ ٹھہر!''

لمحہ بھر نندا خاموش بیٹھا۔ گانا شروع کرنے سے پہلے گویا جس طرح طنبورے کے سُروں میں گم ہوا بیٹھتا ہے

اُس طرح وہ بیٹھا تھا تجھے یاد آتا ہے، اپنے انگلش کلاس کے طلبہ کی ٹرِپ کارلا کیوز گئی تھی۔''

''اچھی طرح یاد ہے! شہد کی مکھیوں کے چھتے کو تو نے پتھر مارا تھا اور مکھیاں اُڑی تھیں سبھوں کو کاٹ لیا اُنھوں نے۔ منہ یہ یہ ہو گئے تھے سوج کر! صرف میں بچ گیا تھا، کیونکہ میں راستے پر ہی بیٹھا ہوا تھا''۔

''ایک غلطی ہوئی! اندو کو نہیں کاٹی تھیں۔ مجھے تو بُری طرح زخمی کر دیا تھا! اسٹیشن پر اندو نے مجھ سے کہا ''اب آپ کہاں جائیں گے؟'' میں نے کہا۔'' ہمارے کمرے پر'' لیکن آپ کو دیکھے گا کون؟ میں نے ازراہِ مذاق کہا۔ ''تم دیکھو'' اور تجھے معلوم ہے۔ وہ پگلی لڑکی۔ گھر گئی اور رات کو میرے کمرے پر آئی۔ رات بھر میرا سر اپنے زانو پر رکھ کر بیٹھی اور دیوانہ وار روتی رہی۔ کیوں کہ کسی نے اُسے بتا دیا تھا کہ میری ماں مجھے چھوڑ کر بھاگ گئی وغیرہ۔ زندگی میں صرف ایک دن کا بچپن مجھے نصیب ہوا۔ آیا اور نیانی کی ڈانٹ ڈپٹ کے بیچ میرا بچپن گزرا۔ کبھی کبھار ڈیڈی ہوش میں رہیں تو سمندر پر مجھے لے جاتے، بس!''

''لیکن کالج میں اس کا کسے بھی علم نہ ہو سکا''۔

''صبح میں اُسے اس کے گھر چھوڑ آیا تھا''۔

''اور اس کا بوڑھا؟''۔

''اُسے اس نے کیا کہا تھا وہی جانے! رات بھر آنکھ سے آنکھ نہ ملا کر بیٹھی رہی۔ پگلی! میرے منہ پر تھو لگایا۔ پلّو سے ہوا دے رہی تھی۔ تجھے کیا بتاؤں چمچہ سے چائے پلائی اُس نے مجھے۔ اُس رات کتنے برسوں، بعد میں پہلی بار رویا تھا۔ اور اس رونے میں کبھی کسے نہ کہا ہوا میرا حال اُس کو کہہ سُنایا۔ نومبر کا مہینہ تھا۔ ٹھنڈی میں کڑکڑاتی وہ صبح میرے ساتھ چل رہی تھی۔ میں نے اپنا کوٹ اُسے پہننے پر مجبور کیا تھا۔ وہ راضی نہیں ہو رہی تھی۔ پھر، اومائی گاڈ ۔۔۔ چائیلڈِش!''

''کیا رے؟''

''میں نے اسے قسم دی!''

''کس کی؟''

''میری! اور اس باؤلی نے کہا، توڑ دی کہہ، توڑ دی کہہ۔ ایسا کچھ کہتے ہیں یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ میں نے کہا،

پہلے کوٹ پہن لے، وہ کہہ رہی تھی پہلے ٹوٹ گئی کہہ۔۔۔ پھر میں نے ٹوٹ گئی کہدیا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ ٹوٹ گئی نہیں کہنے سے کیا ہوتا ہے؟۔۔۔انسان مرجاتا ہے؟ اُس نے فوراً میرے منہ پر ہاتھ رکھااور کہا مجھ سے پہلے تجھے میں مرنے نہیں دونگی۔ میں نے کہا، کیوں ری؟ ویسی وہ پگلی بول اٹھی۔ ماں کا دُکھ کتنا عظیم ہوگا اس کا احساس کل رات مجھے ہوا۔ ایسے عجیب وغریب تصوّرات تھے اس کے۔ ہم رجسٹرڈ میرج کرنے والے تھے ! تو ہمارا گواہ اوراس کی ایک سہیلی دوسرا گواہ بننے والی تھی۔ اورشادی ہونے کے بعد پہلے وہ مجھے۔۔ ہنسے گا، مجھے۔۔ مجھے بھی ہنسی آرہی ہے۔۔۔ کیسے دیوانے لڑکے تھے رہے ہم لوگ۔۔۔ وہ مجھے نہلانے والی تھی۔ ٹیکا سر پر لگانے والی تھی۔۔۔ اور جھاری سے دودھ پلانے والی تھی ۔۔ ایسا پاگلوں سا کورٹنگ کیا ہوگا کیارے کسی نے؟۔۔ یہ پگلی۔۔'' وہ خط ہاتھ میں پکڑتے ہوئے نندانے کہا۔''لیکن یہاں بھی ایک ہٹلر آیا۔ کوئی وجہ نہ تھی۔ اندو اُس رات اس سے کہنے والی تھی۔ لیکن وہ بوڑھا ہاتھ میں لکڑی لئے جاگتے بیٹھا تھا۔

میں نے اُسے دروازے پر چھوڑا اور مجھے چیخ سنائی دی۔ میں ویسے ہی اس کے گھر میں گھس گیا۔ باہر ریٹائرڈ ایجوکیشنل انسپکٹر کا بورڈ لگانے والے شخص نے مارنا شروع کردیا تھا۔ اس کے ہاتھ کی لکڑی چھین کر میں نے اس کے منہ پر جمادی۔ بوڑھا تلملا کر نیچے گر پڑا۔ اندر سے ایک خاتون دوڑتی ہوئی آئی۔ اِندو سے کچھ بڑی ہوگی وہ اس بوڑھے کی تیسری بیوی! آس پاس کے لوگ جمع ہوگئے۔ اور میں نے اِندو سے کہا'' چل! ایسی ہی چل میرے ساتھ''بوڑھا غصّے سے اندر گیا سوئے ہوئے دو بچے کھینچ لایا، دروازے میں پھینک دیا۔ پالنے کا ایک بچہ لاکراس کے پاؤں کے پاس پٹک دیا اور اور چیختے ہوئے بولا۔''جا...... تیری تعلیم کی خاطر اتنے پیسے خرچ کئے بوڑھاپے میں۔ اِن بھائیوں کے پیٹ میں دونوالے ڈالیگی ایسا لگا تھا۔ روند ڈال انھیں اور جانکل دروازے سے باہر !

''ایسا کہہ کر وہ بوڑھا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اندو '' نندا '' کہہ کر چلائی اور زینے سے دوڑتی ہوئی اوپر گئی۔ گئی وہ گئی۔ اس کے بعد اسکا ایک خط آیا تھا...... وہ کھو گیا کہیں تو۔''

'' لیکن یہاں لوٹنے پر تو ملا نہیں اُس سے !''

'' میں !نہیں ''

'' ملنے کی خواہش ہوتی ہے کیا تیری ؟''

'' بہت کر کے نہیں ! ''

'' بہت کر کے نہیں یعنی ؟ ''

'' یعنی ....سچ کہوں کیا تجھے، مجھے کچھ بھی نہیں لگتا۔ ''

'' پھر تو مجھ سے کیسے ملتا ہے؟ ''

'' کچھ سمجھ میں نہیں آتا میرے۔ شاید فنہ بھی ملوں ''

'' ایسا مت کر بابا ! تو نہ ملے تو میں تیرے دروازے پر آکر کھڑا رہونگا ! ''

پھر ہم نیچے بڑے ہال میں کھانا کھانے کے لئے گئے۔ ایک ٹیبل کے پاس تین لوگوں کے کھانے کے لئے کانٹے چمچے رکھے ہوئے تھے۔ میں ایکدم گھبرایا ہچکچایا۔ اتنے میں کسی سنستھان کی رانی کی طرح نظر آنے والی ایک عورت سفید لباس میں آئی۔ پچاس سے اوپر کی عمر ہوگی اسکی۔ اس نے نندا کی پیشانی چومی۔ میں نے دھیان نہیں ہے جتانے کے لیئے دوسری طرف دیکھنا شروع کیا۔ اتنے میں اس عورت کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے نظر آنکھوں پر پڑی اور میرے ذہن میں کچھ یاد آرہا ہے ایسا احساس ہو رہا تھا اور نندا کے لفظ میرے کانوں میں پڑے۔

''میری ماں !''

تیسری خالی کرسی پر وہ بیٹھی۔

اب بھی سنیچر کی دوپہر ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے اور نندا اپنے وہ خاص انداز میں کہتا ہے ۔

''پھاٹک کے پاس کھڑا رہ ''۔

میں اُس کا انتظار کرتے پھاٹک کے پاس کھڑا رہتا ہوں ۔ ☆ ☆ ☆

(ویکتی آنی ولّی)

انتو بروا

رتنا گری کی اس درمیانی گلی میں معروف لوگ رہتے ہیں۔ دیوتا نے ان لوگوں کو نرالے ڈھنگ سے گڑھا ہے۔ اُن میں رتنا گری کے لال پتھروں کے، ناریل، کٹھل کے، کھجلی والے الو (تیرہ) اور پھٹ کہتے ہی جان گلے میں لانے والی گیلی سپاری کے سارے گُن جمع ہو گئے ہیں۔ رتنا گری کے اناج میں ہی یہ بھوت پریت پوشیدہ ہے یا پانی میں زندگی عطا کرنے والی ہوا کے ساتھ اور کوئی ہوا ملا دی ہے۔ وہ اُس رتنا گری وشویشور کو ہی معلوم ہے۔

انتو بروا اسی مٹی میں اُگ آیا اور پک گیا۔ دراصل انتو بروا کو کوئی صرف انتو کہہ کر پکارے ایسی اس کی عمر نہ تھی۔ میں نے بارہ چودہ سال پہلے اُنھیں دیکھا اُس وقت ہی اس کی داڑھی کے کھونٹ اور کان اور چھاتی پر کے بال پکے ہوئے تھے۔ دانتوں کا بیشتر حصہ انتو گو گٹے بن گیا تھا۔ انتو گو گٹے ہونا یعنی گر جانا یہ انتو نے مراٹھی زبان کو عطا کئے ہوئے فقرے کا روپ ہے۔ رتنا گری کا انتو گو گٹے وکیل کئی سالوں سے مسلسل الیکشن میں گرتا (ہارتا) آیا ہے۔ اُس وقت سے کنویں میں درختوں سے بھور بھی گر جائے تو بھور کا'' انتو'' ہو گیا کیا ایسا انتو چلاّ تا ہے۔

رو برو انتو کو کوئی انتو کہہ کر نہیں پکارتا لیکن اس کا ذکر صیغہ واحد میں ہوا کرتا۔ ممکن ہے، کوکن کے لوگ صیغہ واحد میں گفتگو کرنے والے۔ لیکن انتو سے تخاطب '' انتو شیٹھ '' سے ہوتا ہے۔ اس چیت پاؤن سے ویش پیشے کی سند پہلے زمانے سے چپکی ہوئی ہے۔ انتو کے ہاتھ سے وہ گناہ سرزد ہوا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم

کے وقت بندرگاہ پر کسی چیز کی دُکان ڈالی تھی۔ وہ کب کی ڈوب چکی۔ لیکن انتو کے سیٹھ بننے کے لئے اُتنی وجہ کافی تھی۔ اُس کے بعد انتو نے روزی کے لئے کیئے ہوئے کام کاج کی یاد کسے بھی نہیں۔ دو وقت کے کھانے کی اس کے لیئے کہیں تو سہولت ہے۔ تھوڑی زمین ہے ، ناریل کے پانچ پچاس، سپاری کے دس پندرہ اور کوکم کے کچھ درخت ہیں۔ دو پانچ درخت آپوس آم کے ہیں۔ کہیں کٹھل تو کہیں اِملی کا شجر کھڑا ہے۔ آباء اجداد کی وراثت سے سے گھر کے حصے میں ایک کمرہ وپڑوی (پچھلا کمرہ) آئے ہیں۔ کنویں پر استعمال کا حق حاصل ہے۔ اِن سارے سہاروں کے بل پر انتو سیٹھ کھڑے ہیں۔

اسکی اور میری پہلی ملاقات باپو ہیکشٹے کی دُکان پر ہوئی۔ میں سگریٹ خریدنے گیا ہوا تھا اور ''کیسری'' اخبار کے عقب سے نیم جستی ڈنڈیوں والی عینک اپنی پیشانی پر لیتے ہوئے انتو سیٹھ نے سوال کیا تھا۔

'' وکیل صاحب کے داماد نا ؟ ''

'' ہاں ! ''

'' فوراً میں نے پہچان لیا ! بیٹھے ! باپو داماد صاحب کے لئے چائے منگوائے۔'' اچانک اتنی گہری پہچان وتعلقات والا یہ معمر شخص کون ہے میری سمجھ میں نہیں آیا پر انتو سیٹھ نے ہی خلاصہ کر ڈالا۔'' تمھارے سسُر ہمارے دوست ہیں۔ کہیئے اُنھیں انتو بروا پوچھ رہا تھا۔ ''

'' ٹھیک ہے ! ''

'' کب پونے سے تشریف لے آئے؟ ''

'' پرسوں ہی آیا ہوں۔ ''

'' برابر۔ دیوالی کا تہوار ہوگا۔ مانگئے اچھی فورٹ گاڑی ! کیا ؟ ''

'' آپ کے دوست ہے نا آپ ہی کہئے ۔''

''واہ آخر پونے والے آپ، بولنے میں ماننے والے ہیں کیا ہمیں! پھر آپ کا قیام ہے یا فلائنگ وزٹ؟''

'' دوتین دن بعد جاؤنگا۔ !''

'' بہتر ! '' تھوڑے ہی میں لطف رہتا ہے۔ اس سڑے والے کسو پر وکیل کے داماد کی طرح مت کرنا۔ اس

نے چھ ماہ کے لئے خیمہ گاڑ دیا۔ بالآخر کسو پر وکیل نے ایک دن صحن میں گوبر لیپنے لگا دیا۔ ! داماد زیادہ دن رہ جائے تو وہ تکلیف دِہ ستارہ بن جاتا ہے۔ کیسے ؟''

''درست ہے !''

''باپو شیٹھ، پہچانا یا نہیں ؟ ہمارے وکیل کے داماد ! ہم دونوں بھی اُن کے ہی مؤکل ہاں ! ''

ہینکشٹے نے نمسکار کیا۔

'' چائے لیں گے کیا ؟''

'' نہیں جی، خوب گرم ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

'' جناب رتنا گیری میں گرمی رہیگی ہی۔ مویشیوں کے باڑے میں سونے والے کو یہ کہکر کہ بیل کے مُوت کی بدبو آرہی ہے چلے گا کیا؟'' آخر میں 'کیا' اوپر کی لئے میں اُٹھاتے ہوئے انتو شیٹھ بولے رتنا گری میں ٹھنڈی ہوا ہوتی تو شملہ نہ کہتے ہمارے گاؤں کو !لیکن تپش کی تمھارے سڑے پر بہت تکلیف !دوپہر کے وقت سائیکل پر پاؤں ماریئے اور سیدھے پہنچ جایئے ہمارے سپاری کے باغیچے میں سونے کے لیئے۔ سپاری کا باغ یعنی ائر کنڈیشن ہال! '' کھل کر ہنستے ہوئے انتو سیٹھ بولے۔ اوپر سے ''ہمارا یہ کنٹری مذاق داماد صاحب'' یہ بھی کہہ دیا۔ ''باپو سیٹھ، مہمان قلم کار ہیں صاحب ہمارے آباشیٹے کی طرح ناٹک لکھے ہیں۔ زیادہ بولیئے مت ورنہ لکھ دیں گے تم پر نمونے کا بہروپ!''۔

انتو بروا تک میری کردار کی رسائی سے حاصل شدہ خوشی باپو شیٹھ ہینکشٹے کے سوال سے ناپید ہوگئی۔ مجھے اچھی طرح عزّت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے،'' کیا کرتے ہیں ؟ ''

'' کیا کرتے ہیں یعنی ؟ آپ بے وقوف تو نہیں ہینکشٹے ؟ وہ رذی نکال۔ دس جگہ تصویر کے نیچے نام شائع ہوا ملے گا تمھیں۔ سنیما میں رہتے ہیں۔ ''

''کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' ہینکشٹے میری جانب ''میں نے برہما پالیا'' کہیں ایسا چہرہ بنا کر دیکھتے ہوئے کہا؛ ''داماد صاحب ایک بات پوچھوں کیا؟'' عیاری بھرے سوال کا شوق چہرے سے عیاں تھا۔

'' پوچھیے تو ''

'' ایک سنیما نکالنے پر کیا ملتا ہے تمہیں ؟ ''

میں کوئی پہلی بار کوکن میں نہیں آیا تھا ، اس لئے یہ سوال میرے معمول میں سے تھا۔

'' وہ سنیما سنیما پر منحصر ہے۔ ''

'' نہیں ہم نے پڑھا ہے ایک لاکھ ڈیڑھ لاکھ ملتے ہیں .... ''

'' مراٹھی سنیما میں اتنے کہاں کے ؟ ''

'' سمجھ لیجئے !پانچ صفر میں سے تین تو وہ گرتے ہی ہونگے .... ''

'' گرتے ہیں کبھی کبھار ڈوب بھی جاتے ہیں ! ''

'' اجی، وہ تو چلتا ہی رہیگا۔ دھندا کہیں تو چڑھنا اور تو ڈوبنا آ ہی گیا۔ اور ایک بات پوچھوں کیا؟ ....یعنی خفا نہ ہونگے تو .... ''

'' نہیں غصہ کس لئے کیا جائے ؟''

'' سنیما کے اداکاروں کے بارے میں ہم یہ جو کچھ پڑھتے ہیں وہ سچ ہوتا ہے یا محض گنگا دھر واشٹے کے اصل بیلگاوی مکھن کی طرح آٹا ملایا ہوا؟''

'' یہ جو کچھ یعنی ؟ ''میں نے خواہ مخواہ تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا۔

'' مان گئے استاد ہیں داماد صاحب! کورٹ میں گواہ کے طور پر خوب نام کمائیں گے ! اجی صاحب، یہ جو کچھ یعنی سیدھی انگلی کو ناک تک لے جانے والا معاملہ ہے یہ .... ''

یہ سیدھی انگلی کو ناک تک لیجانے والی بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ آخر انتو شیٹھ نے اپنی سیدھی انگلی نتھنوں سے لگاتے ہوئے عملی طور پر خلاصہ کر ڈالا۔ اسی اثناء ہیکشٹے کی منگوائی ہوئی چائے آ گئی۔

'' لیجئے ''! انتو شیٹھ نے میرے ہاتھ میں کپ دیا اور اس چائے والے بچّے کو '' رتنا گری کی ساری بھینسیں اچانک حاملہ ہوگئیں کیا جھمپیا ؟ ''ایسا جاتے جاتے چائے کے رنگ پر ریمارک مار دیا اور رکابی میں چائے اُنڈیل کر پھر پھر پھونکنا شروع کر دیا۔ سچ کہا جائے تو اُس بچّے سے چائے میں دودھ کم ہے یہ وہ کہہ سکتے تھے لیکن انتو شیٹھ کا ہی نہیں پوری گلی کا بولنا ٹیڑھا ۔

انتو کی اور میری پہچان اب پُرانی ہوگئی ہے۔ پچھلے دس بارہ سالوں میں جتنی بار میں رتنا گیری گیا اُتنی بار میں اُن سے ملاقات کر آیا۔ اُن کے حلقۂ احباب میں اُنھوں نے مجھے ڈھال بھی لیا۔ ایک دو بار گنجیفہ (تاش) سکھانے کی کوشش بھی کی اور اُس ساٹھ سال کے قریب وجوار میں کھڑے بزرگوں کے حلقے میں پھر انتو شیٹھ اور اُن کے ساتھی کا زندگی سے متعلق نرالا فلسفہ ومنطق سنتے آیا ہوں۔ اُن کا خاص اسلوب زبان وہاں میری سمجھ میں آیا۔ کندھے پر پیرہن، کمر میں دھوتی ، پاؤں میں نئی چپل ، ایک ہاتھ میں ڈنڈا اور دوسرے ہاتھ میں قندیل لئے، ''اے گوند بھٹ ،ڈالے گا کیا دوداؤ ؟ '' یا '' پرانچے ِگ رہا ہے یا سوگیا ہے تیرا اجگر؟ ''ایسی آوازیں نکالتے تاش کے کھلاڑی ساتھی جمع کرنے والے اُس گروپ میں میں بھی بھٹک گیا۔ تاش کا داؤ کچھ خاص نہ جم پائے تو پتے پھینک کر

''داماد صاحب کہئے ایک آدھ مالکوس۔ گڈ بولے پیٹ تھوڑا طبلہ مہمان کے ساتھ۔ کھا تو شیٹھ کے لیے تمھارا ڈبہ۔'' ایسی فرمائش کے بعد میں اپنی آواز بھی صاف کر لیتا۔''نرڈے (گلے) میں مزہ ہے ہمارے !'' یہ داد وہاں مل جاتی۔ سال دو سال بعد ایک آدھ سفر رتنا گری کا ہو جاتا۔ ہر پھیرے میں البتہ ایک آدھ ممبر کے چل بسنے کی خبر ملتی۔

'' داموکا کا کہیں نظر نہیں آئے انتو شیٹھ ! ''

'' کون : دامونینا؟ وہ مرے میں ہے ! اوپر رمبھ اس کے سر پر تیل تھوپ رہی ہے اور اُروشی پنکھا جھول رہی ہے کہتے ہیں ''

'' یعنی ؟ ''

'' اجی! یعنی شیر کے پنجے !دامونینے کی رتنا گری سے بدلی ہوگئی ! '' کہہ کر انتو شیٹھ نے آسمان کی طرف اُنگلی دکھائی۔

'' ارے، ارے، ارے مجھے معلوم نہیں ہوا ''

''اجی صاحب ،معلوم کیسے ہوگا۔ دامونینا چل بسا کہہ کر کیا ریڈیو میں خبر دینے والے ہیں ؟ کیسری میں شائع ہوا تھا مکمل سوانحی خاکہ۔ ملنسار ،شفیق ،اور دھرم پالنے والا تھا ایسا لکھا تھا۔ دامونینا کہاں کا شفیق ۔ جنازہ پر

پڑا ہوا تھا لیکن پیشانی پر کے بل برقرار! ایک رات گھر میں گرمی بہت پڑ رہی تھی اس لئے صحن میں سو گیا وہ وہیں مردہ حالت میں پایا گیا! نیک انسان۔ پچھلے سال آشاڑ کے دن ویکنٹھ لوک چلا گیا۔ رتنا گری میں دو پالکیاں نکلیں آشاڑی کو ایک وٹھوبا کی اور دوسری دامونینا کی۔ آشاڑی کو وہ گیا اور وجئے دشمی کے دن دتو پرانجپے نے سرحد پار کر ڈالی۔ آخر زندگی کا سونا بن گیا۔ ایک گیا، دوسرا گیا اب تیسرے کا انتظار کر رہا ہوں ! شرارتی انداز میں کندھا اڑاتے ہوئے انتو شیٹھ نے کہا۔

کم و بیش پانچ فِٹ کی اونچائی ، سُرخی مائل گورا رنگ ، چہرے پر باریک باریک داغ ، بھوری ادھ کھلی آنکھیں، بڑھتی عمر کے لحاظ سے جھریاں پڑی ہوئیں، سر پر تیل کی کنارا اُبھری ہوئی ٹوپی، بدن پر کُرتا ، کمر میں گھٹنے تک دھوتی ، پاؤں میں کوکنی چپّل، دانت کی آدھی صف غائب اس لئے کھُلے مسوڑھوں کو زبان لگا کر بولنے کی عادت اور ان سارے لوازمات کے ساتھ وزن لگ بھگ سو پونڈ۔ ان ساری عمر کے ساتھ ختم ہوتی چیزوں میں ایک بات تروتازہ یعنی ناک سے نکلتی ہوئی مگر صاف آواز اور سر پر پشت در پشت تھوپے ہوئے کھوپریل تیل کی عطا کردہ وراثت میں آئی ہوئی روشن ذہنی ! ۔

انتو شیٹھ ہی نہیں ، بلکہ اُس گلی کے اس عمر کے سارے نمونے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ایک ہی راہ و رسم اور موڑ و نیم موڑ والے ہیں۔ زبان کو پاؤں سے لپٹ کر فُر سا سانپ کی طرح کاٹنے کی عادت سی پڑی ہوئی ہے۔ کسی کے اچھے ہونے کی خوشی و تسلّی نہیں، بُرا ہونے کا دکھ نہیں۔ پیدا ہونے کی خوشی نہیں اور مرنے کا غم نہیں۔ گانے کا شوق نہیں، بے دلی بھی نہیں۔ کھانے میں لذّت سے زیادہ شکم سیر ہونے کا واضح مقصد۔ زندگی کی سیدھی سادی گاڑی، اس میں انجن نہیں اس لئے کُر کُر کرنے کی نوبت نہیں آئی ہے اس لئے تیز رفتاری سے دوڑی نہیں۔ چال البتہ کوکن کے راستوں کی طرح بل کھاتی ہوئی نصیبوں میں اشوتھاما کے گھر کی آٹے کی دودھ کی پیالی! اس کے گھر میں آٹے کا دودھ بنا۔ یہاں بھگوان نے ناریل کا کلپ ورکش عطا کیا ہوا لیکن اُس میں کھوپرے سے زیادہ اس کے خول سے لگاؤ !۔

موسم سرما میں بمبئی کی دوّم ناٹک کمپنی ناریل کے جھاپ کی بنی ٹاکیز میں ''ایکچ پیالہ'' لے کر آئی تھی۔ اداکار بس نام کے تھے۔ پہلا ایکٹ ہو گیا تھا، باہر سوڈے کی بوتلوں کی خرید و فروخت زوروں پر تھی۔ لیمپ کی دھیمی

روشنی میں انتو شیٹھ کی مورتی نظر آئی، انتو شیٹھ سیر و سفر کرنے والے مینیجر سے بحث کررہے تھے۔

''بھیڑ کیسی ہے ؟''

''ٹھیک ہے !''

''پلان تو سارا خالی نظر آرہا ہے۔ چھوڑتے ہیں کیا آدھے ٹکٹ میں؟''۔

''نہیں نہیں !''

''اجی صاحب ،نہیں نہیں کہہ کر جھٹک دے رہے کیوں چھپّر جھٹکنے کی طرح ؟ پہلا ایکٹ میں نے یہیں سے سُن لیا ہے ۔سندھو کے کردار میں کوئی دم نہیں ہے تمھارے ''لاگے رُدھی ہُر ہُر''یعنی بالکل بے مزہ گایا ہوا۔ بال گندھروا کا سُنا تھا کیا؟ حسبِ معمول آخر میں ''کیا''جوڑتے ہوئے انتو شیٹھ نے کہا۔

مینیجر بھی ذرا ناراض ہوا ''آپ ناٹک دیکھنے چلیئے یہ ہمارا اصرار نہیں ہے''۔

گاؤں میں اصرار کے بورڈ تو آویزاں کردیے ہیں۔اور کل گھر گھر اشتہار کے ٹکڑوں کا نیوتا لئے گھوم رہے تھے تمھارے بینڈ والے! جناب یوں بھی خالی کرسیوں کو ناٹک دکھانا ہوگا۔ چار آنے میں طے کرڈالیئے''۔

''چار آنے میں دیکھنے کے لئے کیا ڈومباری کا کھیل ہے کیا !''

''صاحب ،وہ اچھا! پہلے وہ کھیل دکھاتا ہے پھر تھالی پھراتا ہے ۔تم اُس طرح کرو، اگلے ''کشی یا تیجو پدالا'' کا رنگ جم گیا تو تھالی میں چار آنے ڈال دوں گا ''۔ پاس میں کھڑے لوگ ہنس پڑے اور مینیجر برہم ہوا۔

اتنے میں انتو شیٹھ کی نظر میری جانب مُڑی ۔نمسکار داماد صاحب ۔۔۔!''

''نمسکار''

''کیا جم گیا ہے کیا ''ایکچ پیالہ'' ؟

''ٹھیک ہے !''

''اعزازی پاس سے ہیں کیا آپ ؟باقی آپ بھی اُنھیں میں سے جو ہیں۔ایک نائی دوسرے نائی کے داڑھی کے پیسے نہیں لیتا ایسا کہا جاتا ہے ''۔

''نہیں صاحب ، دیکھئے یہ ٹکٹ ہے''۔

''پھر ٹھیک ہے ''اس لئے نرم سا جواب دیا آپ نے ؟ پیسے گنے ہیں آپ نے؟ وہ سندھو کا کردار تو بالکل بیکار لگا مجھے''۔

''صاحب سندھو کا کردار کیسا؟ کام کرنے والی وہ عورت ہے''۔

''کیا کہہ رہے ہیں آپ! کیسی اُس کی آواز اور کیسا اس کا روپ ؟ دل میں ٹھان لے تو کمر پر اُٹھا لے سدھا کر کو سندھو کیسی ؟ بالکل سندھو درگ ہے مالون کا ''۔

''لگتا ہے دیکھا ہے آپ نے ناٹک!''

''یونہی تھوڑا سا ،اُس کونے کے دو جھاپ (ناریل کے بنے چھپّر) باز و سر کا کر دیکھ لیا تھوڑی دیر !نہیں!اس سے تو بہتر دشاوتاری (رامائن وغیرہ کی جھانکیاں) ''۔

کچھ وجہ نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی رائے کی پیک ڈال کر انتوشیٹھ نکل گئے ۔ باقی اس طرح دن رات پیک ڈالتے اُن کی عمر بیت گئی میری اور انتوشیٹھ کی پہچان اتنے سال پُرانی لیکن اُنکی گھریلو زندگی سے متعلق مجھے زیادہ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔اُن کے حلقے کے انا سانیا نے ایک بار کچھ معلومات مہیا کی تھی ۔کسی وقت بولتے بولتے اُن کے منہ سے انتوشیٹھ کے لڑکے کا ذکر آیا۔

''یعنی ؟انتوشیٹھ کو لڑکا ہے؟''

''ہے؟یعنی کیا؟اچھا خاصا کلکٹر ہے!''

''کلکٹر !''۔

''بھائیکلہ کے اسٹیشن پر ٹکٹ جمع کرتا ہے''۔چہرے کی جھرّیاں حرکت نہ دیتے ہوئے انا نے کہا۔

''پھر والد کو مدد نہیں کرتا کیا؟''۔

''اجی صاحب، کرتا ہے کبھی کبھی ۔اُسے بھی اُس کا سنسار ہے ۔اُس میں بھی بی بی سی آئی کو جی آئی پی کا ڈبہ جُڑا ہوا۔۔''

''اس حلقے کے یہ خاص الفاظ جمع کر لیئے جائیں تو ایک اُلگ لغت تیار ہو گی ۔بی بی سی آئی کو جی آئی پی کا ڈبہ جوڑنا یعنی انٹر کاسٹ میریج یعنی یہ ذہن میں آتے مجھے کچھ دیر ہوئی ۔

''کیا سمجھ میں آ گیا نا! اس لئے انتو شیٹھ کے لئے غسل وغیرہ کرنے کی مشکل پیش آتی ہے۔ لڑکے کے گھر میں کچھ مختلف معمول چلتا رہتا ہے ایسا کہتے ہیں۔ ہمارے انتو شیٹھ کے لئے یہ کیوں کر چلے گا! ایک بار ساری بے عزتی برداشت کر کے پوتے کا چہرہ دیکھنے گیا تھا۔ لیکن ایسے واپس لوٹ آیا مانو حساب غلط بیٹھ گیا ہو۔ دسہرہ، دیوالی کو البتہ انتو شیٹھ کو مل جاتا ہے بذریعہ منی آرڈر والد کی چاہت کا عطیہ! پانچ دس روپیوں کا! اُس میں اظہارِ مسرّت کرتے ہوئے کو کم مونچھوں کو لگا کر گھی کہتے ہوئے پھرتا ہے۔ اور خواہ مخواہ ریز گاری بجاتے رہتا ہے چار دن جیب میں ہاتھ ڈالے''۔

''اجی صاحب، آخر ٹکٹ کلکٹر کی تنخواہ کیا ہوگی؟''۔

''تنخواہ نی ٹلی، لیکن دوّنی چوّنی کا لین دین چلتا رہتا ہے، ایسا کہتے ہیں۔ سچ جھوٹ دیو جانے۔ اور یوں چلتا ہی ہے! لیجئے تو لینے دیجئے۔۔۔ کیا؟ اجی، آٹھ آنے کھائے تو چوکون تاج جواہرات بھرا پہنا کر رتنا گری کے ڈسٹرکٹ جیل میں ڈال دیتے ہیں اور ایک لاکھ کھائے تو گاندھی ٹوپی پہنا کر بھیج دیتے ہیں اسمبلی میں! لوگوں کا منتخب نمائندہ!''۔

سیاست تو انتو شیٹھ کے حلقے کا پسندیدہ موضوع! ۔ ہر سیاسی لیڈر پر اور اصول وضوابط پر قیمتی رائے! کوکن میں قحط پڑ گیا تھا۔ یوں تو وہاں ہمیشہ ہی قحط، لیکن انتو شیٹھ کے لفظوں میں کہیں تو '' فیمن آکٹا نوا ے پاس ہوا ہوا'' قحط زدہ علاقہ میں نہرو کا دورہ چل رہا تھا۔ گاؤں میں کافی ہلچل تھی۔ کسی نے شام کو انتو شیٹھ سے پوچھا، کیا انتو شیٹھ! تقریر کے وقت نظر نہیں آئے!''

''کس کے نہرو کے! اچھاٹ (نہیں) ! ارے یہاں قحط پڑا ہوا ہے............ تو تقریریں کس چیز کی دیتا ہے! چاول دے! یہ یعنی بھاٹے کی کھاڑی میں ڈوبنے والے دالدی کو وشویشور کی گھاٹی پر کھڑے رہ کر قرآن پڑھ کر سنانے جیسا ہے وہاں بول رہا ہے اور یہ یہاں .... اِس کا اُسے فائدہ نہیں اور اُس کا اِسے! تم بڑے بیوقوف۔ آیا نہرو چلے دیکھنے! اور رتنا گیری میں اُسے دکھانے لائق کیا ہے! بال گنگا دھر تلک نے جنم لیا وہ کمرہ اور کھٹیا؟ گنگا دھر پنت تلک کو خواب میں دکھائی دیا تھا کیا رے .... تیری بیوی کی کوکھ سے لوکمانیہ جنم لینے والا ہے! کس کی بھی کھٹیا دکھائی اور اڑا دی بات کہ تلک نے اِس کھٹیا پر پہلی بارتیاں کی آواز نکالی

تھی۔ثبوت کیا ہے ؟ کیا تلک کی ماں کی زچگی کرنے والی دایا بنی تھی گواہ ؟ تلک کی بات چھوڑ دے سو سال بیت گئے اس کے جنم کو۔ تو نے جہاں جنم لیا وہ کمرہ تیری والدہ ماجدہ بتا سکیں گی کیا؟ بڑھیا سے پوچھ آ گھر جا کے پھر مجھے سنا تلک کے اور نہرو کے قصّے''۔

میرے سامنے ہمیشہ یہ سوال رہتا کہ اِن حضرات کے احترام کے کون سے مقامات ہیں؟ گاؤں میں پنڈت آیا کہ اُسے ''پڑھک'' کہہ کر مذاق اڑایا جاتا۔ ''بازار میں جا کر پیسے کا لیمو لانے کو کہہ کھنبے کے قریب لائبریری میں میں جائیگا اور لیموں مانگے گا۔'' ! کس کالڑ کا پروفیسر ہو گیا ہے سنتے ہی انتوشیٹھ فوراً کہہ اُٹھے،'' سرکس کا کیا صاحب؟ پہلے ایک چھترے پروفیسر تھا۔'' کسی نے نئی دُکان ڈالی کہ'' دیوالیہ کی عرضی ابھی سے منگوا کر رکھ کہدیں !'' یہ آشیرواد۔ زندگی کے کس اصول کا عرق یہ گروپ پی گیا ہے بھگوان جانے۔ ان میں سے نصف سے زائد لوگ منی آرڈر پر زندگی بتاتے رہتے ہیں اور ان میں سے کچھ پیسے بچا کر مقدمات لڑتے رہتے ہیں۔ ہر کسی کی مقرر تاریخ۔ وسیع ساگر کا کنارہ ہے، ناریل کے بن ہیں، سپاری کے باغات ہیں، سب کچھ ہے ! لیکن وسیع القلبی کو چھیدتی ہے غربت اور رہ جاتا ہے بھیانک ہنسی و مذاق کا گہرا خول !

کسی بات پر گاندھی جی کا ذکر چھیڑ گیا۔ انتوشیٹھ نے اپنی تقریر شروع کر دی۔'' صاحب، کیسا گاندھی ! جگ بھر پھرا لیکن رتنا گری میں کچھ زیادہ آیا بھی نہیں۔ پکّا وہ ! اُسے اچھی طرح معلوم تھا۔ یہاں اس کی دھوتی کی سراہنا نہیں نہ ہی لکڑی کی۔ ہم یہاں سبھی دھوتی والے اور اس سے زیادہ برہنہ جسم والے ! سوت وغیرہ کی کوئی اہمیت نہیں ہاں! ہمارا شمبھوشیٹھ تا حیات جنیو کا سوت نکالتے آیا ہے۔ برٹش سرکار کا تو چھوڑیے لیکن رتنا گیری کا گلگن کلکٹر تک نہیں گھبرایا ! تیسرا ہتھیار بھوک ہڑتال کا ! یہاں نیم کو کن بھوکا ! ہمیشہ گھی کا کھانے والے کو بھوکوں کا کیا درد؟ ہمیں کیسے ہو ! نہیں۔ آدمی ہوگا بڑا۔۔۔لیکن ہمارے حساب سے اُس کی بڑائی کو کس کھاتے میں درج کیا جائے ؟ اور سوراجیہ کا کہیں تو اس کا تعلق گاندھی سے نہیں تِلک سے نہیں اور ساورکر سے تک نہیں ''۔

''یعنی سوراجیہ کیا آسمان سے ٹپک پڑا ؟''۔

''وہ کہاں ٹپک پڑا اُس کی جانچ آپ کریں۔ لیکن انگریز گیا وہ بیزار ہو کر۔ اجی جناب لوٹنے جیسا کیا رہ گیا تھا

یہاں؟ دھندہ نقصان کے مد میں جانے لگا۔۔ پھونکنے کا پیشہ دیوالیہ! کمبھار مٹکے لے کر گیا، تم پھونکتے رہو گوبر کا ڈھیر! یہ سب عجیب سا بن گیا ہے۔ حکومت انگریزوں کی نہیں، ہندو کی نہیں اور جنتا کی بھی نہیں۔ حکومت ہے وِشویشور کی!''

''پھر تمھارا وشویشور انگریزوں کے قبضے میں کیسے گیا؟''۔

''بیوقوف ہیں کیا آپ! ویشویشور مضبوطی سے ہے راجیوڑے پر، اجی ایک کھیل کر دکھایا انھوں نے''

''ڈیڑھ سوسال کی غلامی کا کیسا کھیل؟''

''اجی، ڈیڑھ سوسال تمھارے! برہم دیو کی رِسٹ واچ کا سیکنڈ کانٹا تک نہیں سرکتا ہزاروں سال بیتے بغیر!''

کوکن کے اس درمیانی گلی کے برآمدے میں، اطراف کے کالے ناریل کے سائے ہلتے وقت قندیل کی روشنی میں وہ تھکے ہوئے سوکھے چہرے اصولوں کی بات کرنے لگ جائیں تو دل دہل جاتا ہے ''اجی جناب سماج وادی تو صرف افواہیں ہیں افواہیں! اجی ایک آم کا پتہ تک نہیں رہتا دوسرے کی طرح۔ برہم دیوتا کے گھر کا ہر برتن نرالا۔ سب لوگوں کے نصیب کیوں کر ہونگے یکساں! لمحہ بھر کے لئے تصور کیجئے کہ سماج واد آگیا ہے۔ وہ رتنا گری کا گاؤں گاندھی سیٹیاں پھونک کر کہتا ہے ویسے آئی کوکن ریلوے اور گئی پانڈو گرو گھر کے پچھواڑے سے۔ اس لئے کیا لولے پانڈیا کے کندھوں کو ہاتھ کے کھونٹ نکل آئیں گے کیا؟ اور ہاتھ نہیں ہے اس لئے جوتے گا اُس کی زمین اور نظر آئیگی اُس کی تھیلی۔ تمھارے اس راج میں لولا پانڈو کیا اُگائے گا اور کیسے؟ وہ تو ویسا ہی رہیگا! سوراجیہ آیا اس لئے ہری ساٹھے کی ترچھی آنکھ سیدھی نہیں ہوئی اور مہادیو گڑ بولے کی توند اندر نہیں گئی یہ دائیں بائیں رہیگا ہی سماج میں۔ اجی، رام راجیہ میں بھی ماروتی کی دم اُکھاڑ کر اپنی پیٹھ سے نہیں جوڑی۔ یہ نر ہی رہ گیا اور وہ وانر ہی رہ گیا۔''

ایسے وقت انتوشیٹھ کی زبان پر سرسوتی رقص کرتی ہے۔

''برابر ہے!''۔

''یوں ہی مُنہ دیکھا برابر ہے مت کہیئے اُس شام راؤ مُرکٹیا کی طرح! غلطی ہو رہی ہو تو کان کھینچئے! تم مجھ سے چھوٹے یہ درست لیکن علم میں مجھ سے بڑے ہیں''۔

انتو شیٹھ کی اس طرح کی بات میں صرف ٹیڑھا مزاح نہیں رہتا۔ اُن کا کہیں تو کچھ تو جلتا رہتا ہے۔ پچھلے چار پانچ سالوں میں رتنا گری میں کچھ زیادہ جانے کا موقع ہی نہیں آیا ۔اب وہاں بجلی آئی، کالج آیا، ٹار روڈ بنے۔ میں دو تین سال پہلے گیا اس وقت انتو شیٹھ سے کہا ۔

''انتو شیٹھ، رتنا گری جھگ مگ ہوگئی آپ کی! بجلی کے دیے آئے۔ آپ کے گھر میں آئی یا نہیں بجلی ؟''

''نہیں تو۔ تاریکی ہے وہ اچھی ہے! کل جھگ مگ روشنی پھیلی تو دیکھیں گے کیا؟ غربت و مفلسی ہی نا؟ اجی صاحب، پوپلے نکلی ہوئی دیواروں اور ٹپکتے کھپریل دیکھنے کے لئے بجلی کس لئے۔ ہماری مفلسی اندھیرے میں غرق اچھی!''۔

انتو شیٹھ من مراد ہنس پڑے۔ اس بار دانتوں کا تقریباً اُتو گوگٹیا ہوا ہوا نظر آیا اس کے علاوہ اڈّے کے ایک دو لوگ ''نج دھام'' (نیند دھام) جانے کا علم ہوا۔ کب نظر نہ آنے والی ایک اپنائیت اور مٹھاس کی جھلک انتو شیٹھ کی باتوں میں مجھے دکھائی دی۔ اڈّے پر کی خالی نشستیں ان کے دل میں کہیں تو گھر کر رہی ہوں گی

''جو گلیکر کے لڑکے کا تبادلہ ہو کر دلّی میں اعلیٰ عہدے پر گیا ہے۔'' انتو شیٹھ خود ہو کر کہہ رہے تھے۔ بوڑھے باپ کو کاشی وشویشور، ہری دوار، رشی کیش لیجا کر لے آیا ہے۔ شمبھو جو گلیکر نے زوردار ماوند (یاترا کے بعد کی جانے والی گنگا پوجا) کا اہتمام کیا۔ گنگا کے پانی کا چھوٹا سا گھڑا سیل بند کر کے یاد سے میرے لئے لے آیا! اگلی بار آپ آئیں گے تو اُس کا سیل توڑ کر گھڑا اوندھا ہمارے منہ میں گرا ہوا نظر آئیگا داماد صاحب۔'' پہلی ملاقات کا طرزِ تخاطب اب تک برقرار تھا۔ اس کے بعد دوبارہ پار سال رتنا گری جانے کا موقع آیا۔ انتو شیٹھ کا گھر کا گنگا جل کا گھڑا خوش قسمتی سے سیل بند ہی تھا۔

''واہ واہ ! کانگریچولیشن داماد صاحب ! ہمیں معلوم ہوگیا ہے۔ جاکر آیئے صاحب، ایک رکویسٹ ہے۔ اب انگریزی میں بات کرنی چاہیئے آپ سے''۔

''کس طرح کی رکویسٹ ؟''

''اُتنا کوہِ نور ہیرا دیکھ آیئے۔ میری یونہی وہ خواہش رہ گئی ہے جناب۔ پنڈ (موت کے بعد کوّوں کو کھلایا جانے والا کھانا) کو کوّا نہ چھوئے تو کوہِ نور کوہِ نور کہیئے۔ وہ چھوئے گا!۔

واپس لوٹنے پر بتادیجئے کیسا نظر آتا ہے وہ۔لندن ، پیرس سب دیکھ آیئے''۔ مجھے خواہ مخواہ اُن کے پیر پڑنے کی خواہش ہوئی۔ میں راستے ہی میں جھک کر نمسکار کیا ۔''طویل عمر پائیں آپ! عقیدت مند ہیں ،اس لئے کامیابی آپ کے قدم چومتی ہے''۔

ابھی میں اجازت لے کر چار قدم ہی چلا ہوں گا کہ فوراً آواز سنائی دی۔

''او داماد صاحب ''

''کیا انتوشیٹھ ''

''جا رہے ہیں وہ اکیلے یا اہلیہ کے ساتھ؟''

''ہم دونوں بھی جا رہے ہیں ''۔

''یہ اچھا کیا آپ نے ! خواہ مخواہ ایک کیڑا رونما ہوا ذہن میں ۔کہا، پردیس میں تعلیم کی غرض سے جا رہے ہیں۔دیویانی کا قصہ یاد آیا، کیا ؟ ہماری بچّی سے بھی آشیرواد کہنا ہاں ! آپ کی قسمت اس کی وجہ سے ہے۔تمھیں اس لئے کہہ رہا ہوں۔دل میں رکھئے، کہیں کہیئے گا نہیں۔چالیس برس پہلے ہماری یہ چل بسی۔دروازے کا آپوس آم کا درخت اُس وقت سے اس لمحے تک بے بور رہا۔سیکڑوں کی تعداد میں آم پایا ہے ایک وقت اس درخت کا۔لیکن قسمت کس راہ پر چل پڑتی ہے دیکھئے۔خیر! خیریت سے ہو آیئے۔یہاں سے روانگی کب؟''

''کل صبح ایس ٹی سے جائیں گے!''۔

''ڈائرکٹ ممبئی کیا ؟''

''جی ہاں!''

''یہ اچھا کیا آپ نے !ایک بار وہ سفر طے ہو جائے تو انسان نے پوری دنیا کی سیر کر لینا چاہیئے ، پرسوں اوپر کی گلی کا تانیا جوگ جا کر آیا، اب تک ہڈّیوں کا حساب جوڑ رہا ہے سات آٹھ ہڈّیاں کھو گئیں ایس ٹی میں''

انتوشیٹھ پورا منہ کھول کر ہنس رہے تھے۔اب اُس منہ میں ایک ہی دانت چمک رہا تھا۔

صبح پانچ بجے ایس ٹی اسٹینڈ پر ''داماد صاحب'' یہ انتوشیٹھ کی زوردار آواز سنائی دی۔ میں حیران رہ گیا۔انتو

شیٹھ نے وید کی پڑیا کی طرح ایک پڑیا میرے ہاتھوں میں دی۔

"آپ کا اعتقاد نہیں، یہ میں جانتا ہوں لیکن اتنی پُڑیا رہنے دیجئے آپ کی جیب میں، وشویشور کا انگارہ ہے طیارے کا سفر ہوگا آپ کا یہ معلوم ہوا وکیل صاحب کے ذریعے۔ اتنی پڑیا بھاری نہیں جیب کے لیئے"۔

ایس ٹی روانہ ہوئی اور انتو شیٹھ نے ہمارے خاندان کے ساتھ اپنا کُرتا اوپر اُٹھا کر اپنی نیم وا بوڑھی آنکھیں پونچھیں، اُس دھندلے اُجالے میں اُن کا پیٹھ سے ملا ہوا پیٹ میری آنکھوں پر خواہ مخواہ ضرب لگا گیا۔

کوکن کے کٹھل کی طرح وہاں کے لوگوں میں بھی۔۔۔۔ بہت زیادہ پکے بغیر مٹھاس نہیں پیدا ہوتی اُن میں !۔۔۔ ☆ ☆ ☆

(ویکتی آنی ولّی)

سکھارام گٹنے

''سر یہ پیڑے'' ۔ سکھارام گٹنے نے ایک پڑیا میرے ہاتھوں پہ رکھ دی ۔

''کس لیئے رے؟'' ۔

''ذہانت کے ٹیسٹ میں کامیاب ہوگیا'' ۔

''خوب!'' ذہانت کے امتحان کی سطح میرے ذہن میں آ گئی۔ ''کتنے فیصد نمبر حاصل کیۓ؟''

''اب تک نمبرات کا اوسط معلوم نہیں ہوا ہے۔ معلوم ہونے پر بتادوں گا۔ لیکن ۶۵ فیصد تو ملنے چاہیئے'' ۔

سکھارام گٹنے دانشورانہ مراٹھی بولتا ہے۔ بارش کے دنوں میں رستے میں بھیگے ہوئے لاچار کتّے کو اُٹھا کر گھر میں لے آئیں ، ویسا ہی اس گٹنے کا اور میرا معاملہ ہوا۔ جن کی طرف بھی نظر اُٹھائی تو سوائے انتہائی ہمدردی کے اور کوئی جذبہ یا احساس پیدا نہیں ہوتا ایسے لائق ہمدردی والوں میں وہ ایک ہے۔ باقی لوگ تو نہ جانے کیسے کیسے چہرے پر تاثرات پیدا کر کے جنم لیتے ہیں! کوئی سدا یتیم خانے کا چندہ مانگنے آئے ویسا، کوئی ابھی ابھی بس پکڑنے میں ناکام رہا ہو جیسا، کوئی ہمیشہ کا تعجب میں پڑا ہوا، تو کوئی خواہ مخواہ خیالات میں مگن، تو کوئی بے وجہ پیشانی پر کھڑے بل ڈالے ہوئے ہو۔ سکھارام گٹنے کے چہرے پر ہوا نکلے ہوئے فُٹ بال کا تاثر ہے اُس کا پہلا درشن ہوا وہ بھی اسی انداز میں۔ درحقیقت یہ لڑکا میرا کوئی بھی نہیں ہے۔ میرے ایک تقریر کے بعد میری اور اس کی ملاقات ہوئی۔ یہ اُس وقت میٹرک کے کلاس میں پڑھتا تھا۔ آدھے پاجامے میں سفید کُرتا ڈالا ہوا، ناک کی سیدھ میں گاندھی ٹوپی پہنے ہوئے ، چھوٹی سی کچھ تاثر نہ دیتی ہوئی آنکھیں ، کالا رنگ ، بے

ترتیب دانت ۔۔۔اس رعب سے یہ لڑکا اُس ہال کے دروازے پر کھڑا تھا۔ میں ہار اور گلدستے لئے باہر آیا اور اُس پر نظر پڑی۔ اُس نے بہت ہی ادب کے ساتھ نمسکار کیا ۔

''آٹوگراف''۔۔اپنی بیاض آگے بڑھاتے ہوئے وہ بولا۔

''نہیں نہیں، میں آٹوگراف وغیرہ نہیں دیتا''۔ میں نے یوں ہی غصّے کے انداز میں کہا۔

''جیسی آپ کی مرضی''۔

اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ دیوتا کو نمسکار کیا جائے بالکل اُس طرح۔ دوسرے کسی نے مجھے اس طرح نمسکار کیا ہوتا تو میں غصّے میں آجاتا۔ البتہ سکھارام گٹنے کا نمسکار اِتنا خلوص بھرا تھا کہ وہ نمسکار مجھے کہیں بھی جا کر چُبھ گیا۔ آٹوگراف دینے سے انکار کا یہ کوئی میرا پہلا موقع نہیں تھا، لیکن نہ دینے میں کوئی مطلب چھپا ہے ایسا بھی نہیں ہے۔ پر کبھی کبھار ننّھے ننّھے بچّوں کے سامنے خواہ مخواہ پابندِ اصول بن جانے کا شوق چرّاتا ہے۔ سکھارام گٹنے کونے میں کھڑا تھا اتنے میں ادارے کے سیکریٹری ایک بڑا رجسٹر لیکر میرے سامنے آئے۔

''ادارے میں آئے جملہ چھوٹے بڑے مہمانوں کے آٹوگراف ہم اس میں لیتے ہیں۔ پونے کے پونے میں رہتے ہوئے بھی آپ سے ملاقات کا آج ہی موقع آیا ہے''۔

میں نے وہ رجسٹر دیکھنا شروع کر دیا۔ طرح طرح کے لوگوں نے ادارہ دیکھکر اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ میں بھی اپنی بے اطمینانی کا اظہار کروں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا اس لئے دو چار جملوں میں اظہارِ اطمینان کر ڈالا اُس کے بعد منتظمہ کمیٹی کے ممبران کے ساتھ چائے پانی (گلوکو بسکٹ ،چوڑا اور کیلے !!) ہوئی ۔ اراکین کا موزوں مذاق بھی برداشت کر رہا تھا۔ لیکن کھڑکی کے باہر اپنی بیاض لئے کھڑا سکھارام گٹنے خواہ مخواہ مجھے بے چین کرنے لگ گیا تھا بالکل قابلِ رحم نظروں سے وہ اندر دیکھ رہا تھا۔ اُس عمارت کے لمبے چوڑے دالان میں ایک کونے میں یہ چار ساڑھے چار فٹ اونچائی والی جان ۔۔۔ایک آدھ جھاڑو رکھی جائے ویسے کھڑا تھا۔ اُس لڑکے کی طرف اب نہیں دیکھوں گا ایسا دس بارہ مرتبہ تہیّہ کر لیا لیکن نظر اُس طرف مُڑ ہی جاتی تھی۔ کچھ دیر بعد اُس لڑکے کا وہاں اس طرح کھڑا رہنا میرے لئے نا قابلِ برداشت ہو گیا اور میں نے سیکریٹری صاحب سے اُسے بُلا لانے کہدیا۔

''کسے؟ سکھیا کو ! سیکریٹری نے تعجب سے کہا ؟''

''مجھے اس کا نام نہیں معلوم ۔لیکن وہ جو وہاں کھڑا ہے وہ''۔

''وہی سکھیا ہے۔ارے اے گٹنیا''۔

اتنی دوری سے بھی سکھا رام گٹنے کا سہم جانا مجھے نظر آسکا ،اتنی شدت سے وہ سہم گیا۔کسی مجرم کی طرح آکر میرے سامنے کھڑا ہوگیا۔

''کیا نام ہے تمھارا بیٹا؟''میں نے آواز میں ممکنہ حد تک نرمی پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔

''سکھارام آپا جی گٹنے''۔

''اس کا خط بہت ہی خوبصورت ! ہماری تقریری سلسلے کا اشتہار، بورڈ یہی لکھتا ہے۔والد کی سائن بورڈ پینٹر کی دکان ہے، آپا بلونت چوک میں''۔

''ارے ،تیرا خط جب اتنا خوبصورت ہے، پھر آٹو گراف کیوں جمع کرتا ہے ؟''اس بات میں کوئی خاص ایسا پہلو نہ تھا جس پر زور سے ہنسا جائے ،لیکن مجلسِ منتظمہ کے سبھی اراکین ہنس پڑے۔''کس کس کے دستخط جمع کئے ہیں تو نے ،دیکھوں تو سہی ''۔

''میں صرف ساہتیہ کاروں کے ہی آٹو گراف لیتا ہوں''۔آٹو گراف بک میرے ہاتھوں میں دیتے ہوئے سکھا رام گٹنے نے کہا۔میں اُس کی دستخط والی بک دیکھنے لگ گیا۔ہر قلم کار کے تخلیقات سے ایک ایک جملہ چُن کر گٹنے نے اس کے نیچے اس ساہتیہ کار کی دستخط لی تھی۔میں نے آخری اپنا صفحہ کھولا ،وہاں کے جملے کے نیچے دستخط نہیں تھی۔

''یہ جملہ کس کا ہے؟''۔

''آپ ہی کے ایک ڈرامے سے ہے!''سکھارام گٹنے انتہائی احترام سے بولا۔متن سے ہٹ کر ڈھونڈ کر نکالا ہوا میرا ہی فقرہ ،جملہ پڑھتے ہوئے خود مجھے اپنے آپ پر رحم آیا۔

''یہ عبارت تو نے کیوں پسند کی بیٹا ؟''

''یہ فقرہ، جملہ مجھے زندگی جینے کا اصول لگتا ہے''۔

''باپ رے!'' میں نے دل میں کہا۔اس چار ساڑھے چار فٹ لمبے دُبلے پتلے جسم سے زندگی سے متعلقہ اصولوں وغیرہ کی توقع نہیں تھی۔ میں سکھا رام کے چہرے کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔منتظمہ کمیٹی کے ایک معمر رکن پر زندگی سے متعلقہ اصول، ان الفاظ کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوا ہوگا۔اُس نے گٹنے کو کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔

''کیوں کر؟'' تو نے میری کتابیں پڑھی ہیں کیا ؟''۔

''آپ کی طبع شدہ ایک ایک سطر میں نے پڑھی ہے آپ اور سانے گروجی میرے آدرش قلم کار ہیں''۔

''ارے، لیکن پچھلی بار وہ کون آئے تھے اُنھیں تو نے وہ اور سانے گروجی کہا تھا ''۔

سیکریٹری اس شخص خاص کی دسترس نہ ہوا ایسا اَن لکھا قانون ہوگا۔دراصل گٹنے نے دوسرے کسی قلم کار کو بھی سانے گروجی کے ساتھ بٹھا دیا ہوگا۔ بہت ممکن ہے آئندہ ایک دو ہفتوں میں کوئی تیسرا قلم کار آ جائے تو اُس کی اور سانے گروجی کی جوڑی بھی بن جائے۔اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ گٹنے ابھی سانے گروجی کی کلاس سے باہر نکلا نہیں تھا ،البتہ کھڑکی باہر کے دوسرے مناظر اُسے پسند آنے لگ گئے تھے

سیکریٹری کے کہنے سے سکھا رام سکتے میں پڑ گیا۔ میں نے موضوع بدلنے کے خیال سے کہا۔''کس جماعت میں پڑھ رہے ہو''۔

''امسال ایس ایس سی کا امتحان دینے والا ہوں ''۔

''ایسا !'' میں نے اسکی وہ مختلف ادیبوں کے زندگی سے متعلق خیالات سے بھری بیاض کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا۔دستخط کے لئے گھبرا گھبرا کر آنے والا سکھا رام گٹنے یہ کوئی پہلا نمونہ نہیں تھا۔فلاں فلاں شخص یہ دستخط لینے کے قابل ہے یہ غلط فہمی کسی افواہ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ پر دستخط جمع کرنے والے اکثر بچّوں اور بچّیوں کے چہرے پر ایک تُند مزاجی سی جھلکتی ہے۔ بیاض بڑھاتے ہوئے چہرے پر جو تاثر پیدا کیا جاتا ہے وہ احترام کا اعلیٰ ڈرامائی رنگ ہوتا ہے، ہمیشہ دستخط دینے والوں کے وہ دھیان میں آجاتا ہے سکھا رام گٹنے کے چہرے کا ہر ریشہ بدرجہ کمال صحیح تھا۔وہ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں، کچھ جھوٹا، پوشیدہ رکھا ہوا ،دھوکہ دہی کا تاثر دینے سے قاصر تھیں۔

''آپ نے آٹوگراف دیے تو میں زندگی بھر آپ کا احسان مندر ہوں گا ''۔

سکھارام گٹنے کے منہ سے وہ جملے سنتے ہوئے مجھے لگا مانو اس کے منہ میں دانت نہیں چھاپ خانے کی کیلیں بٹھائی ہوئی ہیں۔ یہ لڑکا بدرجہ کمال چھپا ہوا بولتا ہے، لیکن زبان کی وہ طباعت بدرجہ اتم سچ لگتی ہے۔ میں نے اس کی بیاض کھول کر خاموشی سے اس کی زندگی سے متعلق عبارت کے نیچے دستخط کردی۔ اس کے بعد سکھارام گٹنے کے نمسکار سے میرے دِل میں بالکل ایک ہوک سی اُٹھی۔ بُرے حالات کے مارے لوگ شنی کا اثر زائل کرنے والے ماروتی کو تک اتنا تہہ دل اور پُر از جذبات نمسکار نہیں کرتے ہوں گے۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنی شرمندگی محسوس نہیں کی تھی۔۔۔ سکھارام گٹنے، یہ قسم میری زندگی کے کھاتے بہی میں اس دن درج کردی گئی۔ اس واقع کو اب بہت سال بیت گئے ہیں۔ سکھارام گٹنے اُس کے بعد میرے گھر آنے جانے لگا۔ پہلی بار آیا تو دسہرے کے دن سونا تقسیم کرنے کے لئے۔ میرے کچھ دوست گھر آئے ہوئے تھے۔ اُن میں سے کسی نے بھی میرا لکھا ہوا ایک جملہ تک نہیں پڑھا تھا اور اس کے آگے بھی وہ نہیں پڑھیں گے۔ اِس لئے دوستی بے خطر و اٹوٹ ہے۔ رمی، ادھر اُدھر کی گپ شپ، شب بیداری کی بے حد قوّت، ایسے مضبوط پاؤں پر وہ کھڑی ہے۔ ادیبوں کے ساتھ یوں بھی رابطہ کم ہی رہا ہے اس لئے تن تنہا رہ جاؤں تو یہ ادب سے متعلق باتیں برداشت کرسکتا ہوں۔ لیکن میرے ان خاص دوستوں کے اڈّے میں مجھے میرا قاری تو کیا روشنی بھی نہیں بھاتی۔ سکھارام گٹنے اندر آیا اور اس نے بہت ہی احترام کے ساتھ میرے پاؤں کو ہاتھ لگا کر نمسکار کر کے مجھے دسہرے کا سونا دیا۔ میرے نکمّے دوست یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

''آپ نے شاید مجھے نہیں پہچانا ہوگا ''۔

''واہ واہ ! پہچان تو لیا ! گذشتہ دنوں ایکبار آپ میری تقریر سننے آئے تھے ''۔

''یہ سورج نے جگنو کو یاد رکھنے جیسا ہے !'' گٹنے نے حسبِ عادت ایک تحریر شدہ جملہ کہہ دیا۔ اب اس لڑکے کو کیا کِیا جائے سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ٹھیک ہے، بالخصوص سونا دینے کی غرض سے آیا ہوا۔ اسے ایک پیالی چائے تو دینی چاہئے تھی۔ گٹنے کے چہرے کی بھکتی بھاونا (اظہارِ عقیدت) سے میں حیران ہوگیا تھا۔

''مجھے آپ سے چند سوالات پوچھنے تھے ''۔

''ہم دوبارہ پھر ملیں گے چلے گا کیا ؟''

''کب آؤں؟ اپنی تخلیقی مصروفیات کے اوقات کے علاوہ کوئی بھی اوقات بتا دیجئے گا !''

مجھے اُسے چیخ کر کہوں ایسا لگا۔ ''لڑکے۔۔۔ ارے انسانوں کی طرح تو بول، تیری زبان کو یہ چھپائی والا طرز کس گدھے نے دیا! تخلیقی عمل کا کونسا سرکا وقت؟۔۔۔'' لیکن ایسا کچھ بھی میں نے کہا نہیں۔ گٹنے کی آنکھوں میں چھپّن شُبہات بے چینی بسی ہوئی تھی۔ بولتے وقت اُس کی آنکھیں ایسی کچھ ہو جاتیں، اُس کی پیشانی اور گلے کی رگیں کچھ عجیب طریقے سے تن جاتیں، کہ ایسی بے حسی میں اُس لڑکے نے کسی کو گالی بھی دی ہوتی تو گالی کھانے والا گالی دینے والے پر رحم کرتا۔ یہاں تو اُس کی زبان پر موجود سرسوتی نے مراٹھی زبان کا ''کلاس'' کھول دیا تھا۔

''یہ دیکھیئے، اگلے ہفتے کسی شام تشریف لے آیئے ''۔

''کوئی مخصوص دن بتا سکیں گے کیا آپ ؟ نہیں بتا سکیں گے تب بھی چل جائے گا۔ میں روز آنہ آیا کروں گا کوشش یہ تخلیقی عمل کے لیئے زندگی عطا کرنے والی ہوا ہے ایسا گروچیکر کہہ ہی چکے ہیں''۔

''کس نے؟''

'' س۔ت۔ گروچیکر۔۔۔۔۔۔۔۔'کیتکی پولی پڑلی' کا مصنف ''

'' ایسا ! گروچیکر نام کا کوئی مراٹھی میں ادیب ہے، اس کا مجھے علم نہ تھا۔ اور گٹنے کو'' کیتکی پولی پڑلی '' (یہ ناٹک تھا، ناول تھا، یا اور کچھ تھا بھگوان جانے) اس کتاب کے فقرے ازبر تھے۔ اس گٹنے کا معاملہ ہاتھ سے باہر گیا ہوا تھا۔

گٹنے اسی طرح تہواروں پر آتا رہا۔ سنکراتی کے کارڈ، دیوالی کی تہنیت، نئے سال کی نیک خواہشات بلا ناغہ بھیجتا رہا میری تخلیق کہیں بھی شائع ہو جائے تو اس کو پڑھنے کی اطلاع اپنی خوبصورت تحریر میں بھیجتا۔

اس کے بعد ایک شام سکھا رام گٹنے گھر پر آیا، ہمیشہ کی طرح ناک کی سیدھ میں ٹوپی، ہاتھ میں تھیلی، ایسا دُبلا پتلا اور آنکھوں میں عقیدت مندی سے نچھاور ہونے والے تاثر لئے دروازے پر کھڑا رہا۔

'' آیئے ! '' میں نے اسے اندر بلایا۔

'' آپ کی سادھنا میں مخل تو نہیں ہوا میں؟ ''

'' جناب سادھنا کیسی۔ سادھنا کیسی۔ آرام کرتے پڑا ہوا تھا۔''

'' فکرو افکار میں تو ڈوبے ہوئے تو نہیں تھے نا؟ ''

'' نہیں جی ! فکرو تخیل کچھ بھی نہیں۔ ہاں کہیے، چائے لیں گے؟''

'' نہیں چاہیے۔ میں چائے نہیں پیتا۔ ہیجان پیدا کرنے والی مشروبات سے میں پہلے سے دور ہی دور رہتا ہوں۔''

اس لڑکے کے سر میں پانی کے فوارے چھوڑ کر اس میں سے یہ ساری ادبی لفظیات کے جال دھو کر نکالے جا سکتے ہیں کیا اس خیال میں پڑ گیا۔

'' اجی چائے یہ ہیجان پیدا کرنے والا مشروب ہے کس نے کہا؟''

'' اُنتی ماہنامہ کے وجئے دشمی نمبر میں چوکھرے گروجی کا مضمون ہے '' زندگی کی ترقّی کے چھ اقدام! ''

'' زندگی کی ترقّی کے چھ اقدام'' یہ الفاظ گنٹے کے ٹیڑھے میڑھے دانتوں سے بچّوں کی جیبیں اُلٹ دینے پر جسطرح گوٹیاں گر جاتی ہیں اس طرح وہ گر پڑے۔!

'' آپ میری مانیں گے کیا گنٹے۔ ایسے مضامین مت پڑھا کیجئے۔ ''

'' میں اس سلسلے میں آپ کی رہبری حاصل کروں اس غرض سے یہاں آیا تھا۔''

'' رہبری کیسی ؟''

'' مجھے میرا مطالعہ وسیع کرنا ہے۔ صحیح مطالعہ کے بنا اپنی بات میں وزن پیدا نہیں ہوتا۔ ''

'' کس گدھے نے کہا تم سے؟''

'' گنٹے سہم گیا۔ اس کے انگنت گروجی میں سے کسی ایک گروجی کی دھوتی پر انجانے میں میں نے ہاتھ رکھ دیا تھا۔ گنٹے خاموش کھڑا تھا۔ اُس کی ان قابلِ رحم آنکھوں میں اشک آنا باقی تھا۔ مجھے بھی اپنے الفاظ پر غصہ آ گیا تھا۔ لیکن گنٹے کے ایک ایک جملے میرا دل تلاش کر رہے تھے۔۔ اس لڑکے کو کس طرح قابو میں کیا جائے میں اس سوچ میں پڑ گیا تھا۔

''یہ دیکھیے، پی ہی لیجیے تھوڑی چائے۔اس سے قبل کبھی پی تو ہوگی نا ؟''

''ہاں پہلے پیا کرتا تھا '' کسی بڑے جُرم کا اقبال کیا جائے اس طرح منہ بنا کر گٹنے نے کہا۔

میرے کہنے کے مطابق اس نے چائے پی لی۔اس کے کئی اساتذہ میں سے ایک میں بھی تھا۔ چائے پیتے ہوئے اس کے چہرے کی جانب دیکھا نہیں جا رہا تھا۔سرکس میں شیر کی تھالی میں بکری کو کھانا لگاتے ہیں اس وقت بکری کا چہرہ شاید اس طرح بن جاتا ہوگا۔باقی گٹنے اور بکری میں کچھ تو مناسبت تھی بکری درختوں کے پتے کھاتی ہے یہ کتابوں کے اوراق کھاتا ہے۔ میں نے اسے جو جو کتابیں یاد آسکتی تھیں اس کی فہرست تیار کر کے دیدی۔ وہ فہرست پڑھتے وقت اُس کے چہرے پر عجیب اطمینان کا تاثر پیدا ہو گیا تھا۔ کچھ بیس کے لگ بھگ کتابوں کی فہرست تھی۔

''یہ میں نے پڑھی ہیں۔ !''

'' ساری ؟'' میں کرسی سے لڑھکنے کے قریب تھا۔

'' ہاں لیکن پھر سے ایک بار پڑھ ڈالوں گا۔ ''

'' نہیں نہیں ۔۔۔۔ دوبارہ کیوں پڑھیں گے؟'' دراصل مجھے اس سے یہ کہنا چاہیئے تھا کہ، اے دوست آئندہ پانچ سالوں تک روزانہ کا اخبار تک مت پڑھ۔

'' بھسما'' نام کا ایک مرض ہوتا ہے کہتے ہیں اس میں انسانوں کو ''کھاؤں کھاؤں'' کا دورہ پڑتا ہے اور کھالیا کہ بھسم، کھایا کہ بھسم، ایسی مریض کی حالت ہو جاتی ہے۔ گٹنے کو ایسا ہی کتابوں کا بھسم روگ لگ گیا تھا۔اس لڑکے کا کیا جائے میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔آخر میں نے الماری کھولی ان میں کی کتابیں دیکھ کر کھلونوں کی دکان پر جانے کے بعد بچّوں کے چہرے بن جاتے ہیں ویسا اس کا چہرہ بن گیا۔

''ان میں سے جو چاہے کتابیں لے جاؤ '' '' وتسا ،تُج پرت کلیان آسو ''(بچّے تیرا کلیان ہو) کے انداز میں میں نے کہا۔

'' اِن کا مطالعہ کرنے کی خواہش ہے میری ۔ ''

گٹنے کے کہنے پر مجھے بے حد شرمندگی کا احساس ہوا۔اُن کتابوں میں نصف سے زائد کے اوراق تک میں نے

پھاڑے نہیں تھے اپنی تھیلی میں کتابیں بھر کر گھٹنے لے گیا اور میں نے چھٹکارا پانے کی سانس لی

آٹھ دس دنوں بعد ایک دن شام کے وقت" آپ کی سادھنا میں مخل تو نہیں ہوا" یہ جملہ آ کر پھر سے مجھے چُبھ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں کتابوں بھری تھیلی تھی۔ گھٹنے نے آٹھ دس دنوں میں وہ سترہ اٹھارہ سو اوراق کھا ڈالے تھے۔ یہ بالکل علاؤ الدّین کے جادوئی چراغ کے راکھشش والا معاملہ ہو گیا تھا۔ کتابیں دے دیں کہ کھا ڈالو۔

"کیا، کیسی لگیں کتابیں؟" اُسے کچھ نہ کچھ پوچھنا ضروری تھا۔ گھٹنے ایک لفظ کہے بنا کھڑا تھا۔ مجھے لگا اُس نے میرا سوال سُنا نہیں۔ اس لئے دوبارہ میں نے اُس سے پوچھا۔

گھٹنے کی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔ کوئی رونے لگا تو مجھے بڑی بے چینی ہو جاتی ہے "کیا رے کیا ہوا؟" میں اُس سے بالکل تُو تڑا سے بات کرنے لگا۔ اس اپنائیت سے گھٹنے زیادہ ہی سسکنے لگا۔

روتے ہوئے وہ کسی چھوٹے اسکول کے بچّے کی طرح لگ رہا تھا۔ درحقیقت اب وہ بیس سال کی عمر کو پار کر چکا تھا۔ لیکن میں نے اُسے پہلی بار دیکھا تھا اُس میں ذرّہ بھر فرق نہیں معلوم ہوا۔ آدھا پاجامہ کی جگہ اب پائجامہ، کوٹ آ گیا تھا۔ ٹوپی کی نوک اب تک بالکل ویسی ہی ناک کی سیدھ میں تھی اور آنکھوں کا تاثر اب بھی یونہی برقرار تھا۔

"کیا ہوا گھٹنے؟ رومت!"

"مجھے معاف کیجئے"

"کتابیں پڑھنے میں وقت نہیں لگا کیا؟"

"نہیں رات دن ایک کر کے آپ کی ہدایت کے مطابق یہ کتابیں پڑھ ڈالیں۔ یہ دیکھئے"۔ ایک بیاض میرے ہاتھوں میں دیتے ہوئے بولا۔

"پھر!" ایسی اس حالت میں بھی اُس کا "ہدایت" یہ لفظ سُن کر لطف آ گیا۔ جس عمر میں پانچ پچاس مروّجہ گالیاں منہ میں ہونی چاہیئے وہاں "ہدایت" رہبری، تحریکِ زندگی، ہمّت افزائی سے حاصل ہوئی تسلّی، ایسی طبع شدہ الفاظ کا ذخیرہ اس کے منہ میں جمع ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی پڑھنے لائق خوبصورت حرفوں میں لکھی

بیاض کھولی ۔

''اُس میں آپ نے دی ہوئی ہر کتاب کا جائزہ پیش کر دیا ہے'' گٹنے نے ہر صفحہ پر ''جائزہ'' لکھ دیا تھا ۔

''کتاب کو پڑھنے کے لئے لگنے والا وقت رات کو ساڑھے آٹھ بجے سے ایک بج کر پینتیس منٹ ،کُل صفحات دوسو بیس'' اس شان سے ابتدائی کالم بھرے تھے ۔اس کے آگے مصنف کا مکمل نام ،پبلیشر کا نام، پتہ، قیمت ایسی ساری معلومات تھی۔اور پھر نیچے ''جائزہ'' دیا ہوا تھا۔ ''کہانی کا پلاٹ توجہ طلب ہے کردار نگاری حسبِ توقع نہیں۔ کہانی ممبئی ، ناگپور اور لکھنو ان تین شہروں میں وقوع پذیر ہوتی ہے''۔ایسا ہر کتاب کا خوبصورت حرفوں میں پنچنامہ کر ڈالا تھا۔ گٹنے کا یہ مطالعہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔لفظ تو حوض پر کائی جم جائے اُس طرح جم گئے تھے۔آنکھ کے دیپ کیا، دلی اطمینان کیا، دل کا بڑا کمرہ کیا۔نہیں! پیٹ صاف کرنے والی دوا کی طرح منہ کے یہ الفاظ صاف کرنے والی ایک آدھ دوا کیوں نہیں نکل آتی ،اس خیال میں میں گڑ گیا۔آخر کچھ نہ کچھ کہنا ضروری تھا اس لئے میں نے کہا ۔''واہ! خوب باریک بینی سے مطالعہ کر رہا ہے تو ''۔

''میری زندگی کے ادبی میعاد کا یہ آخری باب ہے''۔

''یعنی؟'' کہیں یہ لڑکا اب جان دینے والا تو نہیں ہے ایسا مجھے ڈر لگا۔ کیوں کہ اس طرح کتابیں کھا کر زندہ رہنے والے لڑکے کسی امیر باپ کی صرف گوری ہونے کی وجہ سے خوبصورت مانی جانے والی لڑکیوں کے عشق میں پڑ جاتے ہیں اور پھر یا تو جان دے دیتے ہیں اور ڈرپوک ہوں تو ''اینگری ینگ مین'' اس لئے بے تکی ڈزائن کی پوشاک زیب تن کئے پھرا کرتے ہیں اور دوسروں کے اخراجات پر کافی ہاؤس میں کافی پیتے ، بھیانک نظر آنے والی ، مناسب مونچھ والی لڑکیوں کے ساتھ گندی پکچروں میں اور نظموں میں فن تلاش کرتے بیٹھتے ہیں۔لیکن گٹنے اُن میں سے کہیں بھی بیٹھنے والوں میں سے نہ تھا صرف پٹاخہ چھوٹنے کی آواز سُن کر اُس نے جان چھوڑ دی ہوتی ۔ گٹنے میرے سامنے بیٹھ کر کچھ نہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ایک بار پھر سے اُسے رونا آ رہا تھا۔بطورِ مجموعی کچھ عجب سا ماحول بن گیا تھا ۔ بالآخر گٹنے نے اپنا رونا قابو میں کرتے ہوئے بولنا شروع کر دیا ۔

''مجھے معاف کر دیجئے ۔اس کے بعد میں آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں دوں گا ''۔

''یعنی؟'' میں نے اپنے حلقۂ احباب میں اس گٹنے کا کبھی مذاق اُڑایا تھا کہیں یہ بات اُس کے کانوں تک تو نہیں پہنچی؟ لیکن یہ ناممکن تھا۔ ہمارے دوست اور گٹنے کا تعلق پیدا ہو اس کا امکان نہ تھا۔ ایک پولیس پراسکیوٹر ایک موٹر کے اسپئیر پارٹ فروخت کرنے والا، کوئی فائر انشورنس ایجنٹ، تو کوئی فوج کا کپتان۔ ایسی میری کتھا اور کاویہ (شاعری) کے قریب بھول سے بھی نہ بھٹکنے والے میرے نزدیکی احباب کے درمیان صرف میں ہی ایک لکھنے کا کام کرتا تھا۔ وہ زندگی گذار رہے تھے اور میں لکھتا رہتا تھا۔ ہمارے دوستوں کی بو سے گٹنے کو چکّر آجاتا۔ میں نے گٹنے کو سمجھانے کی غرض سے کہا۔ ''ارے تکلیف کیسی !''۔

''ویسا نہیں، تم نے بہت کچھ کیا میری خاطر، بڑ کے پیڑ کے نیچے ٹھنڈی چھاؤں میں کئی راہگیر آتے ہیں اُس کا بڑ کے پیڑ کو کیا علم!''

''گٹنے کے اس جملے سے گٹنے ''نارمل'' پر آ گیا ہے یہ میں نے پہچان لیا ۔ مجھے بڑ کے پیڑ سے دی ہوئی تشبیہ دیکھکر خواہ مخواہ میری ناک کے نیچے بڑ کی جٹا لٹکنے لگی ہے ایسا مجھے محسوس ہوا اور ہنسی آ گئی۔

''آپ کو میرے اس مسحور کُن جملے پر ہنسی آجانا فطری بات تھی ۔ لیکن آپ کی شفقت بھری ٹھنڈی چھایا میں بیٹھنا میری تقدیر میں نہیں ہے ۔ زندگی بھر !''۔

''ارے لیکن !''۔ مجھے اس ''زندگی ''وغیرہ الفاظ سے بے حد خوف پیدا ہوتا ہے۔ زندہ رہنے کو ''زندگی '' کا نام دینے والے اشخاص ہزار برسوں میں ایک بار پیدا ہوتے ہیں۔ گٹنے نے خود کے زندہ رہنے کو ''زندگی'' کہنا خرگوش نے خود کے تالو کو ہاتھی کا گلا کہنے کے مترادف تھا۔ اُس کے اُس زندگی سے شروع ہونے والے جملے کو بیچ میں ہی توڑ کر میں نے کہا، ارے گٹنے آخر ایسا کیا ہوا؟''

''میری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو رہا ہے!''

لڑکا بالکل ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ سائن بورڈ پینٹر کا یہ لڑکا بذاتِ خود مہا بھارت کا ہیرو ہو اس طرح باب وغیرہ کہنے لگ گیا تھا۔

''کیسا باب !''

''کس طرح کہوں !'' اپنی ڈرپوک آنکھیں پاؤں کے انگوٹھے پر مرکوز کرتے ہوئے گٹنے نے کہا ۔

پھر مجھے یقین ہوگیا کہ، اپنے والد کے نام کا بورڈ محض رنگین بنانے کی غرض سے موٹر سے اُترنے والی گوری جوان لڑکی نے گٹنے کا خاتمہ کرڈالا ہے۔آج تک پڑھے ہوئے سارے ناولوں کا خلاصہ اس کے والد کے ذہن میں آگیا ہوگا اور سکھارام گٹنے کا وہیں خاتمہ ہوگیا ہوگا! آخر میں نے ہی خود اُسے پوچھا۔''کہیں پیار و یار میں پڑ گیا ہے کیا ؟''

'' نہیں ! '' بیجاپور کے دربار میں ننھے شیواجی نے سینہ تان کر بادشاہ کو جواب دیا ہو اس طرح اپنی اٹھائیس انچ والی چھاتی تان کر اس نے کہا۔ ''آج کے دور میں بے لوث پیار کہیں بھی نہیں ملتا۔''

'' کس نے کہا تجھ سے ؟ ''

''آپ ہی کے '' پنچھیوں کے اسکول '' ڈرامے کے ہیرو کا یہ فقرہ ہے۔! ''

میں نے من ہی من میں اپنی پیشانی کو ہاتھ لگایا۔'' پنچھیوں کا اسکول کا مزاحیہ کردار یہ جملہ کہتا ہے۔آخر میرے لئے بھی یہ ناگوار گزرا اور میں نے کہا۔''پھر کیا ہوا تجھے ؟ اِتنا جوان تو ، اِتنا مطالعہ کا دلدادہ۔۔ ۔۔۔۔۔ مجھ سے بھی زیادہ تیرا مطالعہ اور رورہا ہے۔ ؟ ''

'' کیا کروں ؟ حالات ان اشکوں کا سب سے بڑا کارخانہ ہے ایسا والمبے کہا کرتے تھے۔ ''

'' کون والمبے؟ ''

'' ہمارے ''

وہ کوئی والمبے مل جاتا تو تو پرانے سلطان کی طرح اُلٹا لٹکا کر کتابیں جلا کر دھواں دیا کرتا۔

'' ایسی کون سی مصیبت آپڑی تجھ پر؟ ''

'' میرے والد کی سمجھ میں میری زندگی کا مقصد نہیں آرہا ہے۔ ''

میرے سامنے سکھارام گٹنے کا پینٹر باپ رونما ہوا۔میں نے اسے کالا یا گورا دیکھا نہیں تھا۔چونکہ وہ پینٹر تھا اس لئے کالا یا گورا کیا کئی رنگوں والا ہوگا۔اس لفظوں کو انچوں میں گن کر اُن میں رنگ بھرنے والے شخص کے گھر میں پیدا ہوئے اِس بال برہسپتی کی زندگی کا نصب العین کیوں کر سمجھ میں آئے گا۔''مقصد حیات'' کہنے کے بعد''کس سائز میں لکھوں صاحب ؟'' کہنے والا فرد وہ۔ !

''اُنھوں نے میرا بیاہ رچانے کی گھٹیا سی سازش رچی ہے۔'' گٹنے کے چھوٹے سے نیلے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

'' ارے ، پھر اس میں گھٹیا سازش کیسی ؟ تجھے بیاہ نہ کرنا ہو تو منع کر دے اُنھیں ۔!''

'' یہی گزارش کرنے میں یہاں آیا تھا۔ مجھے میرا کچھ نہیں لگتا۔ زندگی کی جنگ کے بارے میں۔ ''

دوبارہ '' زندگی '' ! گٹنے اب بندھن توڑ کر بات کر رہا تھا۔

'' زندگی کی لڑائی میں خون میں لت پت ہونے کے واقعات آئیں گے ہی ۔''

'' ارے ، والد اچھے سے شادی طے کر رہے ہیں تو پھر تُو خون میں کیوں لت پت ہو رہا ہے۔''

''مجھے اپنے بارے کچھ نہیں لگتا۔ میں والد صاحب کے حکم کی تعمیل میں خود کو رشتہ از دواج میں باندھ لونگا! پربھو رام چندر یہ میرا آدرش ہیں !میں بھی والد صاحب کی خواہش کا احترام کرونگا۔ ''

پربھو رام چندر نے شادی کے بعد حکم کی تعمیل کی تھی یہ تفصیل گٹنے بھول گیا۔ اُسی اتنے سے جسم و جان سے پربھو رام چندر وغیرہ لفظ سنتے وقت مجھے ہنسی روکی نہیں جا رہی تھی۔

'' ٹھیک ہے۔ پھر تیرا کیا کہنا ہے ؟میں تیرے والد صاحب سے آ کر ملوں۔! ''

''یہ میں آپ پر چھوڑ دیتا ہوں۔ میں شادی کے لئے تیار ہوں۔ ''

اب البتہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ بہادر جوان جب اپنی گردن نچھاور کرنے تیار ہے تو کیا میں جا کر دشمن کی تلوار کی دھار تیز کر آؤں ؟

''میں ایک بار نہیں، دس مرتبہ شادی کے لئے تیار ہوں لیکن میں آپ کے ساتھ دھوکا بازی کرنا نہیں چاہتا''

'' میں گٹنے کی آنکھوں میں دیوانے پن کی جھلک نظر آتی ہے کیا تلاش کرنے لگا۔''

'' میرے ساتھ دھوکا کیسا ؟ ''

'' آپ بھولے ہوں لیکن میں نہیں بھول سکتا۔ اپنی پہلی ملاقات میں دی ہوئی دستخط میں روزانہ پڑھتا ہوں اُس میں آپ نے پیغام دیا کہ ساہتیہ کے ساتھ جڑے رہو۔ !''

میں کوٹ ٹوپی پہن کر سیدھے اس کے والد سے ملنے گیا۔ ایک پرانے باڑے کے سامنے ہمارا تانگہ رکا۔

باڑے کے کس تاریک کمرے میں یہ ہنومان مجھے لیجاتا ہے اس کا انتظار کرنے لگا۔ اِتنے مین بائیں جانب کی سیڑھی کے اندھیرے سے ایک قوی شخص اترا۔ خوب بڑا گنجا پن، کروت جیسی مونچھیں، کان پر گھنے بال، پیشانی پر دو انگلی والا گندھ، پیٹ کی وسعت قمیض سے جھانکتی ہوئی صاف شفاف دھوتی پہنا ہوا یہ پچاس کے لگ بھگ عمر والا قوی شخص گٹنے کا باپ ہے جان کر میرا سینہ دھڑ کنے لگا۔ اس کے بعد میں نے نمسکار کیا۔

گٹنے کے گھر کے بارے میں میرا قیاس بالکل غلط نکلا۔ پینٹنگ کا کاروبار اُن کے مختلف کاروبار میں سے ایک تھا۔ اس کے والد نے، رنگ کا تو درکنار، ڈاڑھی کا برش تک ہاتھ میں پکڑا نہیں تھا۔ کیوں کہ برآمدے میں کھڑے حجام سے اس نے آج ڈاڑھی نہیں کرنی ہے کہدیا۔ ایسے گھنگھور شخص کے گھر میں ادب کی جڑ کیسے پیدا ہوئی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''آیئے صاحب!'' گٹنے کے والد نے ادھ کھلی آواز میں میرا استقبال کیا۔ ''سکھیا اندر جا کر چائے بنانے کہہ دے بل میں چوہا گھس پڑے ویسے سکھیا اندر بھاگا۔ آدھ گھنٹے کی ملاقات کے بعد یہ معلوم ہوا کہ پونے میں گٹنے کی چھ عمارتیں ہیں۔ گٹنے کے گھر میں بیوہ پھوپھی کے علاوہ کوئی خاتون نہیں یہ سمجھ میں آ گیا۔ اور وہ معمر خاتون دمے کے مرض سے تھکتی جارہی تھی اس لئے گھر میں خاتون کا آنا ضروری ہے اس کا علم ہوا۔ اُس چہرے والے والد نے سکھیا کی ماں اس کی عمر کے بارھویں دن انتقال کرنے کے بعد دوبارہ شادی نہیں کی۔

''سوتیلی ماں یعنی کیا ہے یہ صاحب میں اپنی ذاتی تجربے سے جانتا ہوں۔ آپ جیسے وِدوان شخص کیساتھ کیا جھوٹ کیوں بولوں؟'' ''آج تک تین عورتیں رکھیں!'' انگلی کی سرخ انگوٹھی کی طرف دیکھتے ہوئے گٹنے کے والد نے کہا'' آج آپ جیسے شخص کے آشیرواد کی وجہ سے یہ سب کچھ ہے۔ گنٹے کے باپ کی اِمارت اور مجھ جیسے کا آشیرواد یہ عجب بے جوڑ تھا۔ یہ یعنی نل کے آشیرواد سے بارش لگنے جیسی بات تھی۔ ''جو چاہے سو کیجئے، لیکن بچّے کو شادی کے لئے راضی کروادیجئے۔ !اتنا تونمند شخص میرے سامنے بچھڑا بن گیا تھا۔'' لڑکی تارے کی طرح ہے صاحب !سونگاوکر صراف کا نام آپ نے سنا ہی ہوگا۔''میں نے صراف کا صرف نام ہی سنا ہے یہ بات گٹنے کے باپ سے کہنے سے رُک گیا۔ بُدھوار میں پانچ گھر ہیں۔ اکلوتی بیٹی۔ اچھا پڑھ لکھ لیا ہے چار پانچ کلاس تک اس لئے کنڈلی جم جاتی ہے اور سکھا کچھ پاگلوں سا لئے بیٹھا ہے۔ آپ سے وعدہ کیا

ہے کہہ رہا ہے۔ ''

'' نہیں نہیں ! ''

'' اوپر آیئے صاحب ''

پھر چار پانچ تاریک زینے چڑھ کر ہم سکھیا کے کمرے میں گئے۔ میرے کمرے میں کتابوں کی ایک الماری تھی سکھیا کی دیواریں کتابوں کی الماریوں سے بھری پڑی تھیں اور دیوار پر سامنے گرو جی کے ساتھ میرا فوٹو تھا اُس کے نیچے بالکل میرے لکھے حرفوں میں بورڈ تھا '' ساہتیہ کے ساتھ جُڑے رہیئے'' نیچے میری دستخط کی طرح دستخط تھی۔

سکھیا کی شادی میں میں نے اپنی ساری کتابیں بطور ہدیہ عطا کیں۔ ہر کتاب پر نیا پیغام لکھ دیا تھا۔

'' ادب کے ساتھ جُڑے رہیئے اور زندگی کے ساتھ بھی۔ ! ''

میرے ہاتھوں نے '' زندگی '' یہ لفظ دوبارہ لکھا نہیں۔ سکھیا زندگی کے ساتھ جُڑا ہوا ہے یہ سال بھر کے اندر ہی معلوم ہوا سکھیا کے والد بذاتِ خود چاندی کی پیالی میں پوتے کے پیڑھے لے کر آئے۔ چند سال پہلے سکھیا نے پیڑھے دیئے تھے ؟ اسکے والد نے پوتے کے دیئے۔

سکھارام گٹنے اپنی راہ پر آ گیا۔ اس کی '' زندگی '' سے ساہتیہ کی رکاوٹ نکل گئی۔ پانی بہنے لگ گیا۔

☆ ☆ ☆

(ویکتی آنی وِلّی)

کھانولکر

''اور آسمان کی طرف منہ کر کے اس نے گرجدار آواز میں کہا، باپا تجھے معافی نہیں۔ باڑے پر کے لوگ اپنی توندیں بڑھا رہے ہیں، میرے کاشیا کے پاؤں لنگڑے ہو جاتے ہیں اور موگرا لیکن پھولتا ہی رہتا ہے''۔ (چاپھا)۔۔۔۔ ایسا لگتا ہے کھانولکر پر بھی کچھ بھی نہ لکھا جائے۔ اُن کی کتابوں سے جو کھانولکر کے حصے میں آیا ہے اُسے ہی لیکر تنہائی میں بیٹھ جاؤں۔ اُن کتابوں سے اُسے ہی بولنے دیا جائے۔ اُس کی ہی سُنتے رہیں۔ اُس کے اُن حیران کُن تجربات کی گہرائی تک رسائی کے اہل ہوں یا نہیں اُسے آزمایا جائے۔ دم گھٹنے لگ جائے تو خود کے دل سے ہی شکست مان لی جائے۔ خاموش بیٹھا جائے۔ یہ ایک انوکھا پنچھی اس مراٹھی ادب میں کیا آیا، کیا گایا، کیا ناچا ؛ کبھی جانا۔ جانا سا بولا کیا اور سمجھ پانے اور نہ سمجھ پانے کی سرحد پر کچھ کہتے کہتے اچانک جس انجانے آشیانے سے آیا تھا اُدھر پھر لوٹ گیا۔ اُس کے وجود کی طرح سب کچھ انوکھا۔ میری عمر کی بزرگی کی بنا ہو یا اور کسی وجہ سے کون جانے، کھانولکر سے ملاقات ہو جائے تو وہ قدرے پس و پیش کرتا، خطوط میں احترام کا پہلو برقرار رکھتا۔ اُس کا ''اودھیے'' ناٹک پونے میں دیکھنے کے بعد میں اُسے اپنے گھر لے آیا۔ صبح کا شو تھا۔ اچانک تھیٹر میں ملاقات ہوئی۔ اسکول ٹیچر تختۂ سیاہ پر لکھنے کے بعد جس طرح عینک کی اُپری سطح سے دیکھتے ہیں اُس طرح دیکھنے کی اُس کی عادت تھی۔ منہ حسبِ دستور بھرپور پان سے بھرا رنگا ہوا تھا۔ کوکنی میں '' مُمز کیشے '' کہتے ہیں ویسی ہنا آواز اُس کے ہنسنے کا انداز تھا۔ عمر کا لحاظ رکھا جائے اُس انداز سے سامنے آیا۔ میں نے کہا۔ ناٹک ختم ہونے پر گھر چل، ناٹک ختم ہوا اور ناٹک کی خوبیوں خامیوں پر بحث کرتے ہوئے ہم گھر آئے۔ دو پہر ایک ڈیڑھ بجے کے وقت۔ شام کو پانچ چھ بجے تک ہم محوِ گفتگو رہے۔ اور تعجب کی بات یہ

تھی کہ صرف کھانولکر ہی بول رہا تھا۔ اتنی طویل اور دل کی کچھ بات کہی جائے اس تڑپ سے کی ہوئی باتیں تھیں۔ اتنی ہی اس کے ساتھ میری گفتگو تھی۔

دراصل ذریعۂ معاش کی خاطر وہ ریڈیو کی نوکری کے لئے آیا اس وقت میں بھی ریڈیو میں تھا۔ سرکاری درجات کے حساب سے میں صاحب کے زینے پر تھا۔ کھانولکر اسٹاف آرٹسٹ یعنی ہر فن مولا منگیش پاڈگاونکر کا معاون۔ یعنی ریڈیو پر ناٹک پیش کرنے آئے ہوئے لوگوں کو اسٹوڈیو میں لیجانے، انجینئر کی دل جمعی کر کے کسی ایک کی ریکارڈنگ پوری کرانے، چیک کی پیشگی رسید پر دستخط کروانے، ہر کسی کو ناٹک اچھا ہوا کہنے، وغیرہ کے طریقوں سے نپٹنے کی ذمہ داری اس کی رہتی۔ وہاں بیٹھنے کے لئے اُسے کرسی تک نہیں تھی کیونکہ ہر وقت کسے نہ کسے ''آیئے تشریف رکھئے'' کہنے کی اُس کی ڈیوٹی تھی۔ اُس زمانے میں، میں اور پاڈگاونکر ایک ہی کمرے میں ٹیبل جمائے بیٹھے رہتے۔ کمرے میں اُدباء، ڈرامہ نگار، اداکار، اداکارائیں اور دیگر آنے جانے والوں کا تانتا رہتا۔ گفتگو اور بحث چلتی رہتی۔ اُن میں کھانولکر نہیں رہتا تھا۔ چی۔ تر یہ۔ کھانولکر یا آرتی پربھو اِن ناموں کو جو آگے چل کر مطلب نکل آیا وہ اُن دنوں میں نہیں تھا اور بالفرض رہتا تب بھی ریڈیو میں جہاں مرڈھیکر جیسے اسٹیشن ڈائرکٹر کی شبیہ کو کوئی بھیک نہ ڈالتا تھا وہاں کھانولکر جیسا ٹیمپریری اسٹاف آرٹسٹ کس پیڑ کی پتّی؟ سرکاری نوکری میں پھر وہ چاہے ریڈیو کی ہو یا ریلوے کی، جو اپنا پرموشن رکوا سکتا ہے، تبادلہ کروا سکتا ہے، سسپینڈ یا ڈسمس کر سکتا ہے صرف اس کی قدر و قیمت ہوتی ہے۔ وہاں بھی کسی نے سرکاری نوکری کے لئے نامناسب ہونے کا رپورٹ دے کر کھانولکر کی وہ نوکری گنوانے کا ثواب حاصل کر لیا۔ اس طرح کے بے شمار ثواب آگیں شلوکوں نے نیت کی طرح اس کا تعاقب کر رکھا تھا۔

قحط زدہ علاقوں کے گاؤں کی حدود سے باہری افلاس زدہ خاندان ''زندہ رہنے کے لیئے'' گاؤں گاؤں بھٹکتے رہتے ہیں۔ وینکٹیش ماڈگولکر کی کہانی یا ناول میں، جب میں نے ''لوگ زندہ رہنے کے لئے باہر نکل پڑے'' ان الفاظ کا استعمال پہلی بار پڑھا تب سے میرے دل پر دائمی دردناک گھاؤ پڑ گئے ہیں وہ ایک تہذیب وتمدن، اصول و بے اصولی، نیک و بد ایسے خیالات کو ادھیڑنے والا بھیانک جملہ ہے۔ کھانولکر کوکن سے ویسے صرف زندہ رہنے کے لئے ممبئ آیا۔ پاڈگاونکر، شری پُ۔ل۔ بھاگوت جیسے اس کی شبیہ کی خوبیوں کو

جاننے والوں نے اُسے ''زندہ رہنے'' کا موقع نصیب ہوا اس لئے جدو جہد شروع کی۔ لیکن کوئی نہ کوئی اُسے '' مارڈالنے'' کے لئے بھی انجانی جگہوں پر سدا کھڑے رہتے۔ میں پہلی بار ملا تو صرف ایسے ''جینے'' کی خاطر آئے ہوئے کھانولکر کو اُس کے برتاؤ میں ایسے حالات سے دو چار انسان کی قوّتِ برداشت ملتی۔ ریڈیو کے کاری ڈور میں ایسی قوّتِ برداشت سے ہاتھوں میں سرکاری کاغذات اُٹھائے ٹہلنے والا یہ شخص اندر سے کس قدر انوکھے حوصلے سے بھرا ہوا ہے اس کے دل کو اس وقت اندازہ نہ ہوسکا، خود کو اندر ہی اندر سے شرمندہ کرنے والی زندگی میں جو بھی یادیں ہوتی ہیں اُن میں سے یہ ایک یاد ہے۔ اُن دنوں اُس کے دل میں اُمید جگانے والا ایک لفظ تک اُس شخص سے نہیں کہا اس کا احساس خود سے خود کو شرمندہ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

اس طرح چند ماہ بیت گئے۔ کھانولکر کا ریڈیو کی نوکری سے رشتہ ٹوٹ گیا۔ پاڈ گاونکر وغیرہ کی دوڑ دھوپ ازسرِ نو شروع ہوگئی۔ اُسے ممبئی یونیورسٹی میں لگا دیا۔ ایسی ہی کوئی ''جینے'' میں تعاون دینے والی نوکری۔ پر ان دنوں میں ہی ''ستیہ کتھا'' میں شائع ہونے والی اس کی کہانیوں اور شعری تخلیقات نے اپنی کیمیاء دکھانی شروع کردی۔ اور جن کی صحبت میں راتوں پر راتیں منوّر کی جاسکتی تھیں ایسا یہ شخص اپنے اتنے قریب تھا اور اس کا وہ صرف جینے والے انسان کا لبادہ نظروں سے ہٹا کر اُس کی روشنی دیکھنے کی، اُس کے اُس اٹوٹ خاموشی سے کھینچ کر باہر نکالنے اور اسے بولنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کبھی نہ کرنے کا زخم دل کو کریدتا رہتا ہے۔ ادب میں یا فنونِ لطیفہ کے میدان میں نئے اور پرانے لوگوں کا مِلا جُلا گروپ ہوا ایسا کبھی میں نے محسوس نہیں کیا۔ کئی ایک نا آشنا نئے ادیبوں کی تخلیقات پڑھنے کے بعد اُن کے تعارف کا شوق مجھ میں پیدا ہوا ہے۔ اِن نئے نئے ادیبوں نے بڑھتی عمر کی کائی سر پر جمنے نہ دی یہ اُن کا کتنا احسان ہے۔ فن لطیفہ ایسی کائی اپنے ہلکے ہاتھوں سے دور کرکے اپنے فن کو نئی اُمیدیں دلاتا رہتا ہے۔ ایسے وقت ہاتھ اُن نئے فنکاروں کی پیٹھ پر شاباشی دینے کے لئے بے چین نہیں رہتے البتہ لمحہ بھر کے لئے ان ہاتھوں کا اپنے ہاتھوں سے لمس چاہتے ہیں ،وہ ہاتھ ہاتھ میں تھام کر ''دوست'' کل سے زیادہ آج تو نے کتنا نرالا کردیا مجھے، اس سے قبل میری نظر میں نہ آئے ہوئے انجانے سازوسامان سے مجھے دھنوان بنادیا یہ کہنا ہوتا ہے۔ کبھی ایک آدھ لفظ کا اس سے پہلے کبھی نہ ظاہر کیا ہوا مطلب، کبھی اس سے پہلے نہ سُنے ہوئے سروں کے زیور، کبھی اداکاری کی اس سے پہلے

محسوس نہ کی ہوئی گہرائی۔۔۔۔ایک بالکل نئے آسمان کی کہکشاں کا یہ نذرانہ ہے۔ وندا کرندیکر جب کبھی ''لینے والا دینے والے کا ہاتھ لے لے'' کہتے ہیں اس وقت لگتا ہے، ویسے وہ مناسب طاقتور ہاتھ سنبھالنے والی بانہیں ہمارے پاس نہیں ہیں تو نہ سہی ! ۔وہ احساس رکھ کر دینے والے کے ہاتھ کم از کم اپنے ہاتھوں میں تو لیئے جائیں۔(ورنہ من ہی من میں اپنے ہی ہاتھ جوڑ لیئے جائیں)

کھانولکر کا ہاتھ ایسے متعدد بار ہاتھ میں لینا چاہیئے تھا۔ عمر کی بزرگی کئی بار خواہ مخواہ آڑے آتی ہے بمشکل تمام سال پورا ہوا۔ کھانولکر نے اُس کا ''نکشترا چے دینے'' یہ ناول کا مجموعہ مجھے عطا کیا تھا۔ میں جانتا نہیں تھا۔ ایک روز پوسٹ سے ایک کاپی آئی۔ اوپر' محبت بھرا تحفہ ' لکھکر نیچے چی۔ تر یہ۔ کھانولکر ایسی دستخط تھی۔ ۲۸/اپریل ۱۹۷۵ء یہ تاریخ تھی۔ ایک ماہ بعد ایک بار یونہی کسی وقت بیچ بیچ سے پڑھی ہوئی کوِتائیں پھر سے سلسلہ وار پڑھ لی جائیں اس لئے مجموعہ کھولا۔ اندر کی جانب دوسرے صفحہ پر'' پُ۔لَ۔دیش پانڈے کے لیئے '' یہ طبع شدہ تحریر تھی۔ میں سکتے میں آگیا۔ کھانولکر کو خط لکھ کر پوچھا'' بابا رے مجھے یہ اعزاز کس لئے ؟'' ۲۳ جون ۱۹۷۵ء کو کھانولکر کا جواب آیا۔

اُس میں بھی آخری جملے تھے''۔۔۔اب تک خوب لکھنا ہے۔۔۔خوب لمبی منزل پانی ہے۔۔۔آشیرواد لیتے لیتے آگے بڑھ رہا ہوں'' (یہ اقتباس لکھتے لکھتے ایک اتفاق پر تعجب ہوا ، آج ۲۳ جون ۱۹۷۶ء ٹھیک ایک سال پہلے کا خط)۔۔۔کسی انجانی منزل رسی کے لئے کھانولکر چل پڑا۔ دل میں بس ایک ہوک سی اُٹھتی ہے، وہ یہ کہ، اُس کی غیر معمولی طرزِ تحریر کے درشن سے متاثر ہو کر دل میں لکھ کر رکھی ہوئی پناہ میں آنے کی چٹھی اُس کے ہاتھوں میں بروقت پہنچا دینی چاہیئے تھی۔ اُف! بہت دیر ہوئی !

اُس کے ناٹک کے بارے میں اُس سے میں نے تھوڑے غصّے سے بھی بات کی ہے'' ناٹک'' یہ ایک ایسا فن ہے جو اُسے عظمت عطا کرنے والے ہر شخص سے ذہنی وجسمانی محنت کا متقاضی ہے۔ یہاں صرف غیر معمولی پیار کا حملہ حسبِ ضرورت نہیں ہو پاتا۔ محض وسیع خیالات کی طاقت کا سہارا ناٹک کے کام نہیں آتا۔ کیوں کہ اس کی تخلیق کو عوام کی آنکھوں سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

''ایک شونیہ باجی راؤ'' کا شو دیکھتے ہوئے میں پہلے ایکٹ کے بعد میں بالکل مسحور ہو گیا تھا۔ وہاں سے وہ

ناٹک طوفان میں پھنسے جہاز کی طرح ہچکولے کھاتے کھاتے ایکبار کنارے پر پہنچ گیا دیکھ کر مجھے بے حد دکھ پہنچا تھا ۔ کھانولکر کے اکثر ناٹکوں کا یہی حال ہوتا۔ ناول کے ذریعے دلوں پر اثر چھوڑنے والے کھانولکر کا ''انوکھا پن'' ناٹکوں کے شو میں ہو بہو اسی طرح پیش نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی تخلیقات میں رچی بسی غیر جسمانی ٹھوس سچائیاں اس کے ڈراموں میں ہیرو ہیروئین کی شکل میں گوشت پوست کی بن کر بوجھل ہو جاتیں۔ اس کی رعنائی خیال یہاں ممکن نہ تھی۔ جانی پہچانی حدود کے جنگلے سے اس پار کود جانے کا کھانولکر کا ذوق اس کے سارے ادب میں نظر آتا ہے۔ ''آسمانی دائرے سے اتری ہوئی کہکشاں کی ہلکی سی روشنی ساری اشیاء پر دھندلی راکھ کی طرح بکھری ہوئی تھی۔'' ایسے ایک جملے میں کھانولکر سارے ماحول کی اداسی کی اپنے ناولوں میں عکاسی کر سکتا ہے۔ ناول میں اس جملے کے پاس آ کر ہم چند لمحے کے لئے رُک جاتے ہیں۔ وہ تصویر دل میں اُبھری ہوتی ہے۔ اسے سراہنے کا موقع رہتا ہے۔ ڈرامہ نگاری میں ایسا موقع نہیں آتا۔ کھانولکر نے کئی ایک ناٹک لکھے لیکن اس کے ناٹک دیکھتے ہوئے مجھے لگتا کہ کھانولکر اپنے انمول خیالات کو ناٹک کے تند و تلخ مزاج ! بیتال کی بھینٹ چڑھا رہا ہے۔ اُن کی بہترین تحریر کو ناٹک کے لئے ضروری ہوا ایسا دھیرج میسّر نہیں اس کی تحریر کی رفتار اور تیز رفتاری ناٹک کی رکاوٹ بن گئی کہیں ایسا تو نہیں۔ اس کا مطلب اس نے ناٹک کا چوکرا اختیار کر لینا چاہیئے تھا ایسا بالکل نہیں ہے۔ اپنی بے باک تحریر کے بل پر اس نے ناٹک میں کم از کم سوار ہونا چاہیئے تھا۔ ممکن ہو میری امیدیں غلط ہوں لیکن موزوں نمائش کے اثر سے دور ہوئے ہوئے اُن کے ناٹک دیکھتے ہوئے دل کو تکلیف ہوتی تھی۔ طوفان میں گھرے خلاصیوں کی طرح ہمارے خوبیوں بھرے اداکار رنگ بھومی پر کھانولکر کے ناٹک کی کشتی لئے نکل پڑے ہیں ایسا محسوس ہوتا۔ شعری تخلیقات میں اور کہانی و ناولوں میں بھوت کی طرح گردن پر بیٹھے ابتداء سے آخر تک پکڑا ہوا درخت نہ چھوڑنے والا کھانولکر اپنے ناٹک بیچ ہی میں چھوڑ کر نکل گیا ہوا ایسا لگتا۔ بور تو بے حساب لگ جاتی لیکن پھل نہ آتے !

'' انگات اینے '' وغیرہ قسموں میں مجھے دلچسپی نہیں۔ اس طرف بغرض تفریح بھی میں نہیں گیا۔ لیکن کھانولکر کے تحریر پڑھتے ہوئے وندا کرندیکر کا ''می تر بابا جھپا ٹلیلا'' کی خوب یاد آتی ہے۔ کھانولکر سے

جن کا بہت قریبی تعلق اُنھیں بھی کھانولکر نام کے انسان اور فنکار کھانولکر ان کا متضاد امتزاج پس وپیش میں ڈالنے والا تھا۔ کئی بار تو دلی پریشانی کا باعث بھی بن جاتا۔ عام برتاؤ میں منہ پھٹ پن نظر آئے اس طرح سے وہ بھی پیش آیا۔ البتہ خود کو اور اس پر منحصر کنبے کو زندہ رکھنے کا بوجھ ڈھونے والا کھانولکر اور زندگی کے انسانی رشتوں سے پرے معمات وبھیدوں سے پیچھاڑے جانے کی بنا اُن کی تلاش کرنے والا، ان میں کا وہ ''اتستھ' ان کا جھگڑا کتنا جاندار ہوگا اس کا اندازہ اسے ہی ہوگا جسے کھانولکر کی طرح ستائے جانے کی دوڑ دھوپ برداشت کرنی پڑی ہوگی اس کی مالی حالت کیطرح ہی اس کا ذہنی دانشورانہ سفر اور تخلیقی عمل اور سیسموگراف کی طرح حساس بھی، جس نے اسے سخت اذیت میں ڈال رکھا تھا۔ زندگی کا عام فہم حساب سامنے رکھ کر کھانولکر کے سمجھ میں نہ آنے والے روے کا موازنہ کریں یہ مناسب نہیں ۔

'' نکشترا چیادینا '' کی پہلی نظم کا آرتی پربھو کہتا ہے

'' میری اس انجان کویتا کی راہ پر مت چل پڑنا
کیونکہ وہ جن راہوں پر چل نکلی ہے
وہ ہیں اس کی ناگ موڑی طبیعت سے پیدا ہوئی ہوئیں
ٹوٹ کر رہ جاؤگے۔ ''

پیٹ کی آگ کو آہوتی دیکر اس سے چار جوالا کم کرنے کے بعد جوت لیکر نامعلوم غار میں گھومتے رہیں ایسے بے شمار رازوں سے بھرے اپنے انتر من میں گھومنے پھرنے والا یہ شخص۔ یہ گردش بھی اُصولوں نے اُس کے پیچھے لگا دی تھی اس لئے '' کوی کلاونت '' ایسی پوز نہیں تھی اُس کی۔ یہ کہاں کا وشومبھر بولنے پر مجبور کرتا ہے اس کا خود اُسے ہی تعجب ہوتا ہوگا۔ اس لئے وہ کہتا ہے ۔

''میں خود دیکھتا ہوں خود کی ہی کویتا کو ایک آدھ جلتے ہوئے دیے کی طرح دور رکھ کر'' سچ کہا جائے تو '' جلتی ہوئی دھونی کی طرح '' کہیئے کیا کون جانے۔ ایسا '' دیا '' زندگی کے اَن دیکھے پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے کہ اُس کے وجود کی انسانی عظیم تجربے کا احساس خال خال ہی کسی کو ہوتا ہے۔ وہ اَن دیکھے پہلو کھانولکر کی جملہ تخلیقات اور فن میں اپنا وجود ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ یہ مبہم معنی میں خوبصورت ہوتا ہے ایسا نہیں ہے۔ کبھی

کبھار تو وہ مویشیوں کی ملکیت کی طرح وہ خوبصورتی کی ایسی جھلک دکھا کر جاتا ہے کہ اُس خوبصورتی کے تجربے سے ہم خوف زدہ ہو جائیں۔ کسان فصل کی حفاظت کرتا ہے پہلے پہل حاملہ رہی عورت کی طرح۔ ایسا کہتے کہتے اُس نے ایک نظم میں (آدھار) دھرتی کے حمل سے لیکر زچگی تک نو مہینے اتنی خوبصورتی سے پیش کئے ہیں اور آخری شعر میں تو اُس نے دم دار سچ کو ہاتھ لگایا ہے۔

''دایا کے چہرے پر جھلکنے والی محنت کی طرح ٹوٹ کر نکھر آتی ہے کویتی کی دھار'' اِن دو مصرعوں میں نئے شخص کے لئے نجات جس سے ممکن نہ ہوا ایسی تکالیف اُسے نظر آئیں۔ اُس طرح سے دیکھنا ہی انوکھا اس لئے اس کی بانی سے ایک انجانی کویتا پھولتی گئی۔ پرانے سروں کا ایک آدھ سُر اٹد پڑا ہو تو وہ اتفاقیہ۔ اس کی کہانیوں اور ناولوں میں ہر لحاظ سے انوکھے لوگ ہمیں ملتے رہے ہیں۔ ''وہ میرے اندر کا گھٹاٹوپ اندھیرا کوند پڑتا ہے۔ ایسا خود اس نے ہی کہا ہے۔ ''وہ کیسری آگ کے جوالا کی طرح برہنہ'' ہے۔ اس عجیب '' نرالے'' کی یہ ساری تخلیق عام رہن سہن میں کھانولکر کی راہ میں وہ آتا۔ چکوے کی طرح اُسے وہ انجانی راہوں پر لے جاتا وہاں سے پھر کھانولکر کا عجیب چال چلن آنکھ باندھے ہوئے آدمی کی طرح ہو جاتا۔ اُس کا احترام کرنے والوں کو اُس کے دھکّے لگتے۔ جنتو کھانول والے کو آرتی پر پھوکی بدعا لگ جاتی۔ اُس کی نظم کے اس چڑیا کی طرح ''گیلری کا لمحہ بھر پہلے کا دھوپ کا چوکور دھونڈتے ہوئے'' وہ کھو جاتا۔ اُس کھوئے ہوئے پن کی اس کی وہ بے بس چوں چوں کوِتا بن جاتی۔

''مطلب چیڑا چیڑا ''لفظ مادہ

بولے منٹوں منٹوں مبہم سا

اِن سارے ابہام پر کھانولکر نے اپنی غیر معمولی ذہانت سے دُنیا بنا ڈالی۔ مبہم، انجانا، سمجھ سے باہر، تعجب خیز ایسے اس زندگی کے انسانی واقعات نے اُسے مسحور کر دیا۔ اس سحر آمیزی سے نغمے پھوٹ پڑے، کہانیاں بن گئیں۔ کہانیوں کے خیالی نگر کو کن کے ہیں یہ سچ، یوں تو نرالے نام گانو والے یہ لوگ البتہ کہانی کے آدمیوں کی طرح انوکھے۔ کہانیوں کے رہنے بسنے والوں کی نسل سے۔ اُس میں اُسے ''موت'' نامی اعلیٰ راز سے بے حد رغبت۔ کھیل جماتے جماتے یہ توڑ ڈالتا ہے یہ خیال قوی ہو کر نمودار ہوتا۔ اُس کی چھوٹی بڑی

کہانیاں بالآخر تہس نہس، بربادی ،تشدد کی آگ اور شعلے کے سمندر سے جا ملتی ہیں۔ یہاں پریوں کی کہانی کی طرح ''اور وہ راجکمار اور راجکماری اس کے بعد بہت آرام سے بڑی مدت تک زندگی گذارنے لگے''۔ یہ بھرت فقرہ نہیں ۔

''دیوتا نے دی ہوئی زمیں میں ہم
پناہ گزیں ہوئے 'اجسام بھی اُنکے

اتنا سارا ہوتے ہوئے بھی اپنے بہت سارے ادب میں موت سے جُوی چالاکی بھری برائیوں یا اوپری دکھاوے کی ہمدردیوں سے اس کے ادب کو جوڑنا نامناسب ہوگا۔''تغیر'' یہ لفظ ادبی تخلیق کے سلسلے میں غیر ذمہ دارانہ طریقے سے استعمال کیا جاتا ہے۔ کھانولکر پر یہ الزام اچھے اچھوں نے لگایا۔ خوبصورتی کی طرح تغیر کا بھی ایک سچّا مطلب ہے اس کا کوئی علاج نہیں۔ عام لوگوں کو مبہم مطلب نکالنا راس آتا ہے۔ سبھی اللہ والے بن جائیں ایسی امید رکھنا بھی غلط ہے۔ ہم بنے بنائے جواب لیکر جیتے رہتے ہیں۔ اس میں سہولت رہتی ہے۔ دِل میں کھوٹ نہیں رہتی ۔

مستعار ملے جسم ہمیں
بِکنے والے جوڑے جیسے تیار
فکر نہ غصہ۔۔۔بیسوا کی طرح
لیتے ہیں اصولاً جائز تنخواہ

کم وبیش یہ لگ بھگ ہم سبھوں کا ذکر ہے ۔دُکھ میں سُکھ کی بات صرف اتنی کہ ذاتی سوچ نے بچھائی زین ہمیں مسلسل چبھن نہیں دیتی۔ لیکن جس کسے بھی فطرت کے جان لینے کے کھیل کی تحقیق کا شوق پیدا ہوا اُسے البتہ بار بار موت ! گھر میں، دروازے پر، باہر۔۔۔۔نیند میں ! ہر جگہ۔ اس کے بغیر چارہ نہیں۔ ایسی حالت میں جینے والے کا ایک نئے معنوں میں نیکی بدی کا کنارہ مٹتا جاتا ہے۔ اس کی تحریر میں اچھے بُرے کے لیبل، منسوخ کی ہوئی نوٹوں کی طرح کوڑی کے داموں کے بن کر رہ جاتے ہیں۔ سب کچھ امید کے خلاف ہو جاتا ہے ۔

ادب۔فن کے بہترین جوابات کی قوی خواہش کی وجہ سے ہم کتنے بے تکے بے ڈھب اوراسکولوں میں کام آجائیں ایسے حصے کردے ہیں اس کا احساس کھانولکر کا ادب پڑھتے ہوئے بڑی شدّت سے ہوتا ہے۔ ایک طرح سے اسکول کالج کے مختلف درجات کو پڑھانے کی غرض سے ہی ابواب کئے جاتے ہیں۔سکھانا پڑھانا اس کا مطلب جواب دینا ایسا ہو جانے پر دوسرے بھی کیا کر سکتے ہیں؟" ہر پیش کش پر ایک ایک تیز صفحہ، سراپا گوش"۔ایسی حالت میں اچھے فنکار کو ہی نہیں، بلکہ اس میں دلچسپی رکھنے والے کو بھی گزرنا پڑتا ہے تب کہیں یہ فنکارانہ صلاحیتوں کا احساس ہوتا ہے ۔کھانولکر کی اس حالت سے مکمل طور پر نباہ کرلیا ایسا دعویٰ میں نہیں کرتا۔کوئی بھی نہ کرے۔لیکن اس کے ادبی ہم نشینی میں ایسے کئی لمحے میسّر آئے ہیں کہ اس وقت گلوکار کو سُننے کا موقع نصیب ہوا ایسا لگتا ہے ۔"چانی "ناول پڑھنے کے بعد دل میں اسی طرح کا ایک عجیب سناٹا پھیل گیا تھا۔کھانولکر کے ناول پڑھنے کے بعد "مال ران "یہ لفظ محض تفصیلی نہ رہتے ہوئے ایک تجربہ ہے ایسا احساس ہوتا ہے۔اس نے موت کا احساس دلانے کے بعد عام معنوں میں نا اُمیدی نہ آتے ہوئے الٹی نا اُمیدی کے بے ثمری کا احساس ہوتا ہے۔ممکن ہے یہ"موت"ختم کر دینے والی نہیں ایک نہ ختم ہوئے سفر کی یاد دلانے والی ہے۔شام کے مسحور کُن خوبصورتی کا جواب تلاش کرتے وقت کھانولکر کہہ گیا ہے۔

" شام کا وقت یہ ایسا ۔کس شاعر کا
نام چمن کا جیسے کوئی مصرعہ
شاید ہوگا اگلے جنم کے موت کے
گیتوں میں کا۔۔۔۔۔۔۔۔"

کھانولکر کی مانسی تک کتنے انوکھے بول بولا کرتی

" سایوں کے پرے ایسا ایک دیش
جس کا لباس نہ اُتارا جائے' چڑھایا جائے "

شہرت کے بھیس اور زبان کی سختی بہت بڑی ہوتی ہے۔تکلیف دہ جلد جلانے والا وہ بھیس اور زبان پر مجبوراً نچانی پڑنے والی وہ زبان۔یہ تکلیف اُٹھاتے ہوئے بھی یہاں جینے میں ملے ہوئے سہاروں کو کھانولکر مانتا تھا

"کس کا جلوس جنازہ دیکھ کر کوئی
کوئی بے اختیار نمسکار کرتا ہے
اس پر ہمیں ایک دوجے کے ساتھ
چپ سادھنے کا اختیار نہیں
سکھی۔ساجن کے مستقبل کے جوڑے کی طرح
یہ زندگی بھی ایک دوسرے کی ہی ہے
اس جینے میں گہری ڈُبکی مار آیا ہوا
ایک آدھ کوئی سب کو پیٹ سے تھامنے والا
دونوں کو ہی ایک دوسرے کا سہارا ہے"

اس سہارے کی خوبصورتی اس کی آنکھوں سے نکل پڑی تھی۔تخلیقِ فن کے وقت اس کی حالت یہ سب کچھ میل نہ کھانے والے کی طرح ہوتی اور اس لئے اس کا ادیب مانو کسی نے ہمیں "اب یہ سمجھ لو" ایسا اشارہ دیا ہے مان کر ہی پڑھنا چاہیئے۔اس طرح کا اندر سے صاف ستھرا ہو کر نکلا ہوا ایک آدھ ہی مصنف ہمارے حصّے میں آتا ہے اُس کے عام برتاؤ کی سطح پر اس کے تخیّل کی ساری خوبیوں اور خامیوں کو بھلا کر اُس کی تخلیقات کے سامنے جاتے ہوئے تھوڑا سا نرم ہو کر جایا جائے۔موازنہ کے لئے جھانکنے والے فن سے متعلق حاصل کئے ہوئے اصول وضوابط لمحے بھر کے لئے بازو رکھ دئے جائیں۔تبھی تو "دور نجیدہ سروں کے بیچ خالی بہشت میں" جھانکنا ممکن بن جاتا ہے۔اس تجربے کی سنجیدگی دھیان میں لینی چاہیئے۔خود کھانولکر نے بھی کچھ تجربات کا لمس لیتے ہوئے "میں اُتنا پاکیزہ نہیں" ایسا بے بسی میں کہہ دیا ہے۔

تجربات سے یاد آیا۔کھانولکر کی تحریر میں بے شمار تجربات کی، فلسفے کی، سُر اور بولوں کی دیوتاؤں کی بے شمار تصویریں آسانی سے تیار ہو گئی ہیں۔وہ ایک "الف تا ے" شاعر تھا پھر چاہے وہ ناٹک لکھے یا ناول اس کا تصوّر ہی وہ تجربات کی زبان میں کرتا تھا۔اس لئے اس کی تصنیفات سے بے ڈھب مطلب نکالا نہیں جا سکتا۔اس لئے اس کے نام کے ساتھ جیون ساز، فنون گر، سبق ساز جیسے لیبل چسپاں کرنے کی گنجائش نہیں

ہے وہ لفظوں میں جکڑا ہوا تصویروں بھرا وجود۔ وہ تصویر بھی محض ''ہو بہو'' قابلِ تعریف نہیں۔ خطوط پر زخم پڑ جانے کی وجہ سے، ہوا کا دھکا لگ کر لمحہ بھر میں بادلوں کا ہاتھی بن جائے اور ''ہاتھی دیکھئے'' کہنے تک ڈاڑھی والا بواجی بن جائے ایسی شکل کا۔

یہ تصویریں یعنی تمثیل ہیں یا توضیح اس کی صرف ونحو کے اعتبار سے تشخیص بھی نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ صرف ونحو کے زیور نہیں ہیں۔ '' جسمانی حصے ہی زیورات'' ایسی ہی یہاں زبان کی حالت ہے۔ ''کونڈ وارا'' کے پرشرام تاتیا کو حمل کا پانی کر ڈالنے والی بدّ عا سے نجات دلانے والی جڑی بوٹی دے کر وہ جوگی اُس پہاڑی راستے پر سے گھر کی طرف لوٹا دیتا ہے۔ تاتیا اب قدم راہ پر نچھاور کر بیٹھنے کی طرح بے فکر ہو جاتا ہے اور پہاڑی راستے کے بیچ سے وہ اتنی راہ آسانی سے چھوٹ کر تاتیا کے نرالے نئے پاؤں میں سرک گئی تھی۔ ایسا کھانولکر کہہ گزرا ہے۔ یہاں اپنے خوف زدہ دل کو احساس ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے لئے بھی پاؤں میں باضابطہ سرکائی ہوئی اٹل راہوں کی' ناؤ کی طرح ان شبیہات کی صدائے بازگشت بھی حاصل ہوتی رہتی ہے۔ پھر تاتیا گراموفون کے پِن کی طرح آگے آگے سرکنے لگ جاتے ہیں۔ گراموفون کے پلیٹ میں کندہ گیت، پلیٹ کی گردن پر بیٹھا ہوا اور پلیٹ کی گردش میں ڈوبا ہوا وہ پن کا ہاتھ، وہ کس نے گھمائی ہوئی چابی ۔۔۔ انگنت صدائے بازگشت۔ سر میں مونگیاں چلنے لگتی ہیں۔ اس کے ناولوں میں اندھیرے کی ہی کتنی تصاویر ہیں ۔

''کونڈورا'' گرجاتا ہے اُس عمیق بیورا کو وہ ''اماوس کی طلوع گاہ'' کہہ گیا ہے۔ رات کے وقت مٹھ کی جانب نکلے ہوئے پرشرام تاتیا کو ''جہاں وہاں اندھیرے میں بڑے بڑے رسّے سے بنی لکیریں کھینچنے جیسی نباتات نظر آرہی تھی''۔ کہیں پر ''سرد اندھیرا'' ہے۔ کہیں ''سڑا اگلا اندھیرا'' ہے۔ کہیں اندھیرے کی دیوار پر بڑی گھور پڑ (گوہ) کی طرح چپکی ہوئی ٹکٹکی ہے۔ کئی بار لگتا ہے کہ کھانولکر نے دن سے زیادہ رات ہی دل میں بسالی ہے۔ اُس کا ''اندھیرا'' یعنی محض روشنی کا فقدان نہیں اُسے ''بذاتِ خود'' احساس ہے۔ رات نے اُسے صرف تاروں کا دان نہیں دیا، تاریکی کا بھی دیا ہے۔ اور تاریکی سے اٹوٹ رشتے والے بھوت پریت کا بھی ۔

کوکن کا بچّہ بھوت پریت کی کہانیاں سنتے سنتے ہی بڑا ہوتا رہتا ہے۔ یہاں کے برگد کے درخت ، پیپل کے پیڑ طرح طرح کے کردار لئے کھڑے رہتے ہیں۔

انگنت دکھ درد اور گھریلو جھگڑے کی بنا پر گھر کے پچھواڑے کے چھوٹے کنویں کا ، کنوؤں اور تالابوں کی تہہ کو پہنچی ہوئی کچی عمر کی سہاگنیں، سفید لباس میں ملبوس، بال کھلے چھوڑ کرنا مکمل خواہشات کو پورا کرنے کی امید میں منڈیر کے پاس آ کر اماوس پورنیما کی نصف شب میں منڈلاتی رہتی ہیں ۔یہاں کے بھوت پریت کے لئے صرف شمسان ہی بسنے کی جگہ نہیں رہتی ۔مرنے کے بعد بھی باڑے کی رکھوالی سے بری نہ ہونے والے اہم شخص کبھی ناگ بن کر تو کبھی ایام زندگی میں پہنی ہوئی دھوتی کو کمر میں باندھے اور ہاتھ میں عصاء لئے گشت لگاتے رہتے ہیں یہاں کے مندر میں بھی بے وقت گھنٹا بجتا ہے اور نیند ہی نیند میں دیوتا سے پہلے پجاری کا نمسکار عمل میں آتا ہے معمولی مفاد اور انتہائی اندھے عقیدے کا اس ضمن میں بے تکا امتزاج بنتا ہے ۔اپنی عقلِ سلیم کے زور پر اسے کوئی توڑنا چاہے تو بیتال کھلناتھ کی اصل کو کئی گالیوں کی اسے قسم ہے ۔ان سارے بے حساب واقعات کو درختوں وجھاڑیوں، سمندر کی آواز، بارش کے آندھیوں کا ۔۔۔نہیں پورے فطرت کا تعاون حاصل ہے ۔شفاف چاندنی میں تک درخت پوش لئے کھڑے ہوتے ہیں وہ بھی جادوٹونے والی عورت کا ۔نباتات کی خوشبو پھیلی ہے وہ بھی بھوتوں کے وٹوے تلنے کا ۔اور سرد کے بن بھی سرسراتے ہیں جیسے دھیمی آواز میں چغلی کی جائے ۔کسی جھنجھلائے جوگی کی بخیلی کی بدّ عا کی طرح یہ خوبصورت نظارہ یہاں موجود ہے ۔کوکن کے انوکھے پن کے بکھرے بادلوں کے سے بیکار زیور کھانولکر نے ذرّے ذرّے سے چن لئے ہیں ۔اس کے ناولوں کا لگ بھگ ہر کردار ایسی ہی کوئی بدّ عا کا شکار نظر آتا ہے ۔کئی بار محسوس ہوتا ہے کہیں وہی پھر سے رونما نہیں ہوئے ہیں ۔کیلڈ واسکوپ میں رنگ برنگے کانچ کے ٹکڑے ڈال کر گھماتے رہیں ویسے یہ سارے کردار لیکر کھانولکر گھماتے بیٹھا ہے ایسا لگتا ہے ۔سارے پاؤں کو کہیں نہ کہیں دراڑ پڑی ہوئی، سوراخ پڑے ہوئے ۔دیوتا نے دیگر اعمال نے چھینے ہوئے نہیں بلکہ دیوتا نے ہی چھین لیئے ہوئے ۔رات اندھیاری، اجگر، گونڈورا، گلہری ، تیز طرّ ار ۔بدّ عا سے متاثر مردوزن کی یہ کہانیاں اور ''اگڑبمب باجے ڈمرو'' بولنے والے بھوتوں کی ذات کا انوکھے روپ میں ساتھ نصیب ہو یہ ایسی کہانیاں ہیں ۔ڈھیلا ڈھالا ''وجود '' جس میں کسی بات کو ثابت نہ کرنے کی چھوٹ ۔لیکن کھانولکر کی فکر اور تحریر کی خوبی کی وجہ سے ، اس میں سے اس کے ہی لفظوں کا سہارا لے کر کہا جائے تو '' ایک وسیع خلاء کا الاپ'' سنائی دے اور اس فکری رجحان کا

احساس ہو جاتا ہے۔ اس کو داد و تحسین دے کر پاک و صاف ہو جائیں ایسا لگنے لگتا ہے۔

فکری رجحانات کے مصنف زندگی کے طرح طرح کے بھیدوں کا سراغ لگاتے رہتے ہیں تو تبصرہ نگار اس تخلیق کے اعلیٰ و ادنیٰ کی اصلیت کی سطح کا۔ یہ بھی ایک منجھے ہوئے فنکار کی تخلیق کے اعادہ کی طرح ایک مخلصانہ اعادہ تنقید نگاروں میں جس طرح دوسرے، تیسرے سطح کے ہوتے ہیں اس طرح قلم کاروں میں بھی ، قارئین میں بھی ہوتے ہیں لیکن کھانولکر ان سبھوں کو چکما دے جاتا ہے۔ اس کی تخلیق کی تحریک، انداز اور رتار ملاتے ہوئے سانس پھول جاتی ہے۔ اس پر ہوئے سنسکاروں کی کھوج شروع ہو جاتی ہے۔ '' بچّو بڑھے چلو ......فکر کا برت ہم اختیار کرتے ہیں۔ تمھارے بہاؤ میں خیالات کا بڑا بھنور نہ ہو، منجمد ہو جاؤ گے'' کہنے والے ''سوامی'' اسے انتریامی درشن کب دے گا؟'' اِس تنہائی کی سادھنا کہاں ہوئی ؟ ایک قلمی خاکے میں سندر کا کا کہتے ہیں ۔ ٹیمبے کا ہارمونیم سنا ہے تم نے ؟ اجی صاحب اپنے گووند راؤ جی ہارمونیم بجاتے لیکن وہ بالخصوص ہارمونیم بجا رہے ہیں ایسا کبھی محسوس نہ ہوتا۔ وہ بالکل مختلف تھے۔ ویسے ہی یہ ہم تنہا و مختلف رہیں ایسے شوقیہ معاملات میں۔'' اس کے ناول میں جگہ جگہ ملنے ''پاگل پنا'' ....

''باجی راؤ'' کی بیل ''چافیا'' کی سندھیا،'' کالائے تسمئے نم'' کی شکو، '' ایکا نا ئکا چاانت '' کی وہ '' کھڑکی والی لڑکی'' ....کھانولکر کے لاڈلے لفظوں میں کہیں تو یہ '' بےلطفی '' اُسے مسلسل کیوں اشارہ کر رہی تھی ؟ اس کی تخلیقات میں تین طرح کے نام روپ بسر کرنے والے ایک'' وحشی '' ہے خوبصورتی کا بدصورتی سے بیاہ ہے۔ نظامِ قدرت کی طرح ہی نرم و سخت کا ساتھ جاری ہے۔

میں نے ایک مرتبہ کھانولکر سے کہا'' ارے دو پاؤں کی صحت مند اچّا کو تو نے ٹیکسی کے نیچے کچل کر لولا کیوں کر دیا ؟''۔

چشمے کی کانچ کے اوپر سے دیکھتے ہوئے کھانولکر نے دھیمی آواز میں کہا'' میں نے نہیں کیا۔ وہ ہو گیا''۔

اُس کے کئی کرداروں کے بارے میں مجھے اس سے کچھ پوچھنا تھا۔ اب یوں لگتا ہے۔ اس نے مجھے یہی جواب دیا ہوتا: میں نے نہیں کیا .... وہ ہو گیا...........وہ ہو گئی......... گاؤں والوں نے اسے کچل کر مار ڈالا ....ممانی نے ہی وہ گیت رچے تھے۔ ''

''کس کے کندھے پر کس کا بوجھ'' ایساوہ کہہ گیا تھا۔اس کے کندھوں پر انگنت شخص خاکوں کے، موسموں کے، قرمزی بادلوں کے، تاریکی کے، سانپوں کے، مندروں کے گنبد کے، گابھارے کے، جنگلی راستوں کے بوجھ قدرت نے اس کے کندھے پر لاد دیئے تھے۔ایک ایک بوجھ وہ کاغذ پر اتارتا جارہا تھا مگر بوجھ بڑھتے ہی جارہے تھا۔ بھوت پریت کی طرح وہ اتارے جارہا تھا۔ '' چافا '' کا وشنو کہتا ہے۔

''اب کے ہم گھوڑے بن گئے ہیں '' ہمارے منہ میں لگام ڈال دی ہے کسی نے تو لگام ....'' مجھے مرڈھیکر کے '' کچھ لگاما '' (کس کی باندھی لگام) کی چٹکا دینے والی یاد آ گئی۔

اسی طرح ایک گھوڑا اپنا ہوا کھانولکر تیز رفتاری سے بھاگ رہا تھا۔اس دوڑ میں بھی اس کے کانوں میں خلاء کا مدھم سُر سنائی دے رہا تھا۔'' ٹیونر '' نام سے اس کا ایک شخصی خاکہ ہے۔ہارمونیم کی ٹیوننگ کرنے والے شخص کا۔'' دوسروں میں بہترین سُر کی شناخت کرنے والا ٹیونر۔بھیڑ کی شوروغل اور تاریکی سے بھرے کمرے میں رہتا تھا۔آس پاس بگڑے ہوئے ہارمونیم۔ان کے سمع خراش سُروں میں کہیں اسے سُروں کے تال میل اور سنگت اسے نظر آرہی تھی۔ان بگڑے سُروں کے شوروغل میں سنگیت ڈھونڈتے ڈھونڈتے اسے اپنا سنسار ٹھیک سے جمانے کا موقع ہاتھ نہ آسکا۔وہ ایک کام باقی رہ ہی گیا تھا۔ ''

..............کھانولکر کے ادب کے ٹوٹے ہارمونیم کے ساز کی طرح لوگوں کا اور ان کے ساتھ کھانولکر کے جڑے رشتے ناطے کی کھوج لگ گئی ہے ایسے وقت احساس ہوتا ہے۔لیکن وہ اتنی آسانی سے لگ گئی ایسا نہ کہا جائے۔نہ جانے زندگی کی آخری دنوں میں اس نے اپنے یہاں کے قیام کا تجربہ، اسے حاصل ہوئے ہوئے بے مثل و انمل انفرادیت سے پیش کیا ہوتا.........لیکن اس سے پہلے ہی چھپتر ۔

☆ ☆ ☆

(میتر)

ووڈ ہاؤس

۱۶،فروری ۱۹۷۵ء صبح کی گاڑی سے پونے سے ممبئی جانے کے لئے نکلا تھا۔ برسہابرس سے ووڈ ہاؤس یہ میرے سفر کا ساتھی ہے۔ اُس کی کتابیں باسی ہونے کے لئے تیار نہیں۔ میرے سفر کے بیگ میں دوسری کوئی بھی کتابیں ہوں مگر ووڈ ہاؤس لازمی ہے ۔ یہ میں نے لے لیا۔ اِتنے میں دروازے کی خالی جگہ سے ''سکال '' داخل ہوا پہلے صفحہ پر ووڈ ہاؤس کے رحلت کی خبر۔ ایک ہاتھ میں کبھی نہ مرنے والا ووڈ ہاؤس اور دوسرے ہاتھ میں ۹۴ ویں سال میں ووڈ ہاؤس کے موت کی خبر دینے والا ''سکال'' اُس لمحے مجھے ووڈ ہاؤس کا ایک قول یاد آیا۔ ''لے اونارا'' یہ اُس کی بے حد چہیتی اکلوتی بیٹی فوت ہوجانے کی خبر پانے پر ۶۳ سال کا ووڈ ہاؤس کہہ گیا تھا'' آئی تھاٹ شی واز اِممارٹل''۔

اپنی لاڈلی ''لے اونارا'' اوراس کی موت یہ دو باتیں اس کے خواب میں بھی بیک وقت آئی نہ تھیں۔

''مجھے لگا وہ امر ہے''۔ اِن الفاظ میں اولاد کی دائمی جُدائی سے دُنیا میں والدین کے دل پر غموں کا بوجھ پڑنے والے پہلے نا قابلِ برداشت گھاؤ کو تعزیتی الفاظ کے اظہار کی راہ ملی تھی۔ ووڈ ہاؤس کے موت کی خبر سُن کر دنیا بھر کے اُس کے قارئین نے بھی یہی کہا ہوگا کہ ارے، ہم تو سمجھے تھے وہ امر ہے!

عمر کے ۹۰ سال پار کرنے کے بعد بھی اس کے لکھے ہوئے ناول میں کھلکھلا کر ہنسانے کے گُن موجود تھے۔ ووڈ ہاؤس لکھتے جائیں اور قارئیں ہنستے ہنستے پڑھیں یہ کچھ چند سالوں کی نہیں لگ بھگ ستر سالوں کی روایت تھی، اُس کی تحریر میں مصنف کی بڑھتی عمر کا ذرا سا بھی احتمال ہو ایسی ایک بھی سطر نہیں تھی۔ کہیں احساسِ تھکن نہ تھا تقریباً ستر سالوں سے رچی یہ بازی جاری تھی۔ جس میں ووڈ ہاؤس نہ ہو ایسی دنیا میں ہمیں رہنا

ہوگا یہ خیال کسے بھی چھونہیں گیا تھا۔

پیلہم گرین وھیل ووڈ ہاؤس نام کا ۱۵ اکتوبر ۱۸۸۱ء کو ولادت پایا ہوا یہ انگریز اپنی تحریر کا اسلوب ذرا بھی نہ بدلتے ہوئے روزانہ اپنے ٹیبل کے پاس بیٹھ کر کہانی ، ناول لکھتا رہتا۔ پیلہم گرین وھیل یہ اُس کا نام ذرا زبان پر چڑھنا مشکل تھا اس لئے اس کا خاندانی نام زیادہ ہر دل عزیز ہوا۔ ’’بپتسما کے موقع پر پادری نے ایسا نام دینے پر میں رو چیخ کر احتجاج کر رہا ہوں یہ کسی کے دھیان میں نہیں آیا۔‘‘ اُس نام پر بذاتِ خود ووڈ ہاؤس کی یہ شکایت ہے۔ قریبی لوگ اُسے پلم کہہ کر پکارتے تھے۔

پلم کی کہانیوں، ناولوں کے ماحول کا بدلتے سماجی حالات کے ساتھ ذرا سا بھی رشتہ نہ تھا۔ اور اُس کی اُس نے پرواہ بھی نہ کی۔ اس پر تعجب کی بات یہ تھی کہ اس کی نوّے بیانوے سال میں لکھی ہوئی کتابوں کی فروخت دس لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ اُن میں جدید مغربی تہذیب کی عکاسی کرنے والے ناولوں سا جنسی بیان نہ تھا، خون ڈکیتی نہیں تھی، خون نکل آنے تک چلنے والی لڑائی نہ تھی، گالی گلوج نہیں تھی، بیزاری نہیں تھی، کوئی بھی سماجی مسئلہ نہیں تھا۔ سیاسی رازوں کا انکشاف نہیں تھا۔ اگر کچھ تھا تو پرانا انگلینڈ اور وقت کی دھارا کے ساتھ بہہ گیا ہوا اُس سماج کا ایک طبقہ۔ وہ انگلینڈ بھی پلم نے برسوں پہلے چھوڑ دیا تھا۔ امریکہ میں نیویارک کے پاس وہ آکر رہائش پذیر ہو گیا تھا۔ اس کا خاندان خود اُس پر، اُس سے چار سال چھوٹی اس کی پیار کرنے والی، بے حد فکر رکھنے والی ساتھی ایتھل، کچھ کتے اور بلیوں پر مشتمل تھا۔ تخلیقات پر لاکھوں ڈالرس ملتے رہنے کی وجہ سے لانگ آئلینڈ پر ریم سین برگ نام کے مضافات میں رہائش کے لئے ایک خوبصورت چھوٹا سا بنگلہ۔ آس پاس چند ایکڑ باغ۔ اُس میں گھنی جھاڑیاں اور اُن جھاڑیوں سے گزرنے والی پگڈنڈیاں۔

پلم کی زندگی بے حد نپی تلی۔ صبح جلد اُٹھ کر بنگلے کی دہلیز میں آجاتا۔ بارہ نمسکار کی طرح ہاتھ پاؤں پھیلانے کی ایک ورزش بارہ مرتبہ کرتا۔ عمر کے نوّے سال گزر جانے کے باوجود پلم کی ورزش کے معمول میں فرق نہیں آیا۔ گھر میں بیداری آئی ہوئی نہ رہتی۔ پھر خود اپنا ٹوسٹ تیار کرتا، چائے بنا لیتا۔ یہ ناشتہ بڑے اطمینان سے چلتا۔ ایک آدھ مزے دار کہانی (اکثر کرسٹی گاتھا) یا پسندیدہ قلم کار کی کتاب پڑھتے پڑھتے ناشتہ پورا ہوا، دوسری ضروریات سے فارغ ہوئے کہ سحر گشتی پر نکل پڑتا۔ ساتھ گھر کے کتے ہونا ضروری تھے۔

کتے اور بلیاں یہ پلم کا دائمی حلقۂ احباب۔ایک بار صبح کا سیر سپاٹا پورا ہوا کہ نو بجے کے قریب وہ مطالعے کے کمرے میں داخل ہو جاتا۔کہانی ناول کے ریشے جوڑنا شروع کر دیتا۔اُن کی تخلیقات سے اِس شخص نے انگنت لوگوں کو دھیمی آواز سے لے کر اونچی آواز تک ہر قسم سے ہنسایا۔صرف ہنسایا نہیں پی۔جی۔ووڈ ہاؤس یہ لت لگا دی۔کسی نے انگریزی کتابیں پڑھنے والوں میں ووڈ ہاؤس پڑھنے والے اور ووڈ ہاؤس نہ پڑھنے والے ایسے دو حصّے کئے تھے۔جس میں آگیٹ اس معروف لیکن کسی کی تعریف کرنے میں بے حد کنجوس اور منفی یا خلاف تنقید میں سخت نقاد نے کہا ہے"تھوڑے بہت ووڈ ہاؤس پسند کرنے والے ایسے اس کے قاری اس دنیا میں ہوں یہ ممکن ہی نہیں ہو سکتا"۔ووڈ ہاؤس پسند ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ الف سے ے تک پسند ہے۔یہ اپنے بال گندھرو کے گانے کی طرح ہے جو مکمل طور پر پسند کرنا ہوتا ہے۔

(سدھیشور شاستری فنکار کو ووڈ ہاؤس پسند ہے اور اس کی ساری کتابیں اُن کے تختے پر موجود ہیں' یہ جب میں نے پڑھا اُس وقت اُن کے لئے جو احترام میرے دل میں تھا وہ اُبل پڑا تھا)"لت" سے مختلف دوسرا ووڈ ہاؤس کے لئے لفظ ہی نہیں ہے۔ایسے شوق سے ایسی لت سے جنھیں بگڑنا نہ ہو وہ اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہیں رہ سکتے ہیں۔صرف فلاں اصول یا مذہب ہی میں بنی نوع کی بھلائی ہے ایسا اصرار کرنے والوں نے مصیبت نہیں مول لینی چاہیئے (وہ ایسی مصیبت میں نہیں پڑتے) اُن کے ہنسنے کے عضو پر قدرت نے ہی نہ کھلنے والا ڈھکّن بٹھایا ہوا ہوتا ہے۔اُن میں غرور کی بدبو بسی رہتی ہے اور وہ بلاوجہ بیزار ہو کر جیتے رہتے ہیں۔اُنھیں دائمی جھوٹا سچا دشمن مطلوب رہتا ہے۔ایسے"دشمن" کا سماجی خوف پیدا کرنے میں جو کامیاب ہو جاتے ہیں وہی حکم چلانے والے (حکم شاہ) بن جاتے ہیں لیکن"مزاح" تو دوست جوڑنے والا ہوتا ہے۔اس لئے ایک حاکم کے تحت چلنے والی حکمرانی میں پہلا خون ہوتا ہے وہ مزاح کا ظرافت کا۔

ووڈ ہاؤس جیسے لوگوں کو۔۔۔۔نہیں' دیوتا صفت انسان کو۔۔۔۔۔حکمراں طبقہ کے اس روّیے کی سخت تپش سہنی پڑی۔اس کی اچھوتی طبیعت اور نازک حِس ظرافت اس کی زندگی میں قہر ڈھائے ایسی حالت ہو گئی۔مہذّب دنیا شرم سے اپنی گردن جھکانے پر مجبور ہو جائے ایسی حالت ہو گئی تھی۔ایک مکمل جھوٹ' انسان کو گرم سلاخ سے دئے ہوئے داغ کی طرح' کس طرح چسپاں رہ جاتا ہے اور سرکاری پرچار

کے نام کے تحت چلنے والے ذہنی بُرے خیالات کا خواہ مخواہ شکار ہو کر کس طرح جینا پڑتا ہے' یہ اُسکی دل کو چھلنی کرنے والی مثال ہے' لیکن اس کے ساتھ ہی ان سارے انسانی درد میں اوپر ہی اوپر لطائف بانٹنے والا ووڈ ہاؤس اپنی مزاحیہ تحریر کے ایمان پر کیسے کھرا اُترا اُس کی حقیقت اس شخص کے سامنے احترام سے سر ٹیکنے پر مجبور کرنے والی ہے البتہ ہنسانے والے شخص کو کوئی محترم نہیں گردانتا۔

کبھی بھی نظریے اور اُصول کی تبلیغ یا اس کی مخالفت کی غرض سے ووڈ ہاوس نے نہیں لکھا۔ زندگی کے عمیق نظریے کی فکر نہیں کی۔ اس نے کہا تھا۔ '' میرے سامنے کسی بھی طرح کی رہبری کے اُصول نہیں ہیں میں صرف جی رہا ہوں۔ لکھنے بیٹھوں تو بے وجہ ادھر اُدھر دیکھتے رہنے کی ہمیں فرصت نہیں رہتی۔ ایک کے بعد ایک کتابیں لکھتے رہنا یہی میری زندگی ہے۔ کتنی آسانی سے ووڈ ہاؤس یہ کہہ گیا ہے۔

۱۹۰۲ء میں ووڈ ہاؤس نے پیشہ وارانہ قلم کاری کے میدان میں پہلا قدم رکھا اور ۱۹۴۰ء کے اختتام سے پہلے ۱۲ ڈرامے، ۳۰ مزاحیہ سنگیت والی تحقیقات، سیکڑوں بھاؤ گیت، ۲۵ کہانیاں اور ۴۲ ناول لکھے تھے۔ یہ محض تخلیقی کمال نہیں تھا۔ اس میں سے تقریباً ہر تخلیق کامیابی کی سیڑھی پا چکی تھی۔ گود میں اور کاندھے پر اٹھائے جس طرح بچّے کو کھلایا جاتا ہے اس طرح انگریزی زبان کو کھلانے والے ووڈ ہاؤس نے خود کی ایک الگ دنیا بسالی تھی۔ اس کی زبان اور اس کی منظر نگاری، اس کی اتنی اپنی خود کی ہے کہ اس کے ادب کا ترجمہ کسی بہترین نظم کے ترجمہ کی طرح ناممکن ہے۔ اس کے کردار ایک خاص انگریزی دور کے اور اس وقت کی تہذیب میں اس قدر رچ بسے ہیں کہ اس سے اُنھیں الگ کرنا غلط سمجھا جائیگا۔ اس کے باوجود ووڈ ہاؤس کے مزاح میں ایک اعتماد موجود ہے۔ انگریزی زبان سمجھنے والے دنیا بھر کی مختلف تہذیبوں میں جینے والے لوگوں کو اس لطائف نے، افلاطونی مزاح کی تشبیہہ سے، مزاحیہ مناظر سے آنکھوں سے پانی جاری ہونے تک ہنسایا۔

اس کا برٹی بوسٹر اور جیوز ''اسمتھ'' اس نام کے ہجے بلاوجہ ''پی'' سے شروع کر کے پہلے ''پی'' کا تلفظ ادا نہیں کرتا ہے اس کی وضاحت کرنے والا اور ہمیشہ پیسے ادھار دینے والے کی تلاش میں رہنے والا ''اسمتھ'' لارڈ ایمسورتھ اور اس کا وہ بلونڈنگز کیسل، بیگرز، مُلنر، انکل فریڈ، گولف کہانیوں والا وہ ماہر گولف ''معمر رکن''

آنٹ اگستھا کی بے شمار پھوپیاں ، ممانیاں یہ سارے لوگ اوران کا خالق انھوں نے انگریزی ادب میں یہ ھنگامہ پیدا کر رکھا تھا۔ اس ھنگامے کا اختتام نہیں تھا اور موت سے ہی ماند پڑنے تک اس ہنگامہ خیز کے ہاتھوں کی مشعل بجھی نہیں تھی۔ ایک نقاد نے اس کی تخلیقات کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا ہے۔ ووڈ ہاؤس کی ذہانت تھکنے کو تیار نہیں لیکن نقاد تو توصیفی الفاظ ڈھونڈ نکالتے نکالتے تھکنے لگے ہیں۔

لکھنے سے اسے بے حد اُنس تھا۔ لکھنا یعنی ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر ہاتھ سے کی ہوئی تحریر۔ املا دے کر محرّر سے لکھوانا لینا اس سے نہ ہوسکا۔ ایک بار ایتھل نے ٹیپ ریکارڈر جیسا کوئی آلہ لاکر اس کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کی تھی۔ ووڈ ہاؤس کہتا ہے ''میں'' ''تھینک یو جیوز'' اس ناول کا مضمون اس آلے پر کہنے لگا اور کچھ دیر بعد وہ مضمون سننے لگا تو میرا مجھ سے ہی سنا نہیں جا رہا تھا۔ بہت تھکان پیدا کرنے والا لگ رہا تھا۔ اور میری آواز کسی پادری جیسی ہے اس کا اس لمحے تک خیال تک نہیں تھا۔ وہ اس طرح کی آواز یا وہ آلہ اُن میں سے کوئی ایک میری ٹانگ کھینچ رہا تھا۔ خیر! دوسرے دن میں نے وہ نکما آلہ فروخت کرڈالا '' سامنے شطرنج کی بساط جما کر خود اپنے ساتھ ہی کھیلنے بیٹھیں ویسا یہ اس کے لکھنے کا پروگرام رہتا۔ خود ہی مشکل چال چلیں اور خود ہی اس سے مزے دار چھٹکارا حاصل کریں۔ اس لکھنے کے شوق کے بارے میں خود اس نے کہا ہے۔

'' لکھنے کا کچھ اور ہی لطف ہے۔ آپ فطرتاً اہلِ قلم ہیں تو آپ پیسوں کے لئے ، شہرت کیلئے ، یا زیادہ کیوں کہیں شائع کر کے شہرت پائیں اس لئے لکھنے بیٹھتے ہیں ایسا مجھے نہیں لگتا۔ مجھے تو بار بار لکھنے کی اور وہ لکھا ہوا گھس پونچھ کر صاف شفّاف کرنے کا بے حد شوق ہے۔ ایک بار کاغذ پر اتار دیا۔ پھر وہ کتنا ہی بے ڈھب کیوں نہ ہو......... کہ مجھے لگتا ہے کہ اپنی جھولی میں کچھ کم جمع ہوگیا ..... اے اے ملن تو کہتا ہے کہ کتابیں شائع تک نہ کریں وہ لکھی جائیں۔ اس کی خوبصورت سی جلد طبع کی جائے مصنّف کو پڑھنے کے لئے۔''

''स्वान्त:सुखाय '' یعنی دوسرا اور کیا ہے ؟ تخلیق ادب میں سچ مچ میں ایک کھیل ہونا چاہیئے۔ اس کھیل کا مزہ محسوس کیا جانا چاہیئے۔ ووڈ ہاؤس یہ ادب کا کھلاڑی تھا۔ اس کا خود کا میدان تھا۔ اس کی خود کی ٹیم تھی۔ اس کی کہانیاں ناول یعنی یعنی ان سارے کھلاڑیوں کی زندگی کا ''کھوکھو'' آٹیا پاٹیا، لنگڑی، دوڑ دھوپ آنکھ منچولی، .... وغیرہ مختلف اقسام !اور ووڈ ہاؤس ان کھیلوں کا آنکھوں دیکھا حال بتانے والا مزاحیہ کامینٹیٹر

یہ سب اس کا حلقہ ءاحباب تھا۔ یہاں کوئی کھلنا ئک نہیں کسی کے دل میں پاپ نہیں ۔ یہاں کی ہار جیت کھیل کی طرح ۔ یہاں کا پھنسنا غلطی کرنا، تاش کی بازی کے پھنسنے پھنسانے جیسا۔ یہاں کا پیار، اس پیار میں حائل ہونے والے لوگ، اس میں سر مار کر خوشیاں حاصل کرنے والے نائک، انھیں جیلی کی طرح تھرتھرانے پر مجبور کرنے والی وہ آتیا بائی (آنٹی) ، مصائب سے نجات دلانے کے لئے وشنو کی طرح ایستادہ وہ جیوز ....یہ ایک انوکھا مزے دار ناٹک ۔

ناٹک ہی کہنا چاہیئے ، کیونکہ اس کے کرداروں کا ہنگامہ اور دوڑ دھوپ کسی اسٹیج پر کی جارہی ہو ایسی ہی رہتی ہے ۔ ناول کے کردار بھی ناٹک کے کرداروں کی طرح ہمیشہ حرکت میں رکھنے چاہیئے یہ ووڈ ہاؤس کا ہی خیال تھا۔ اس نے ان کرداروں کو سُست ہونے نہیں دیا ایک ایک سین یعنی ایک لڑھکن سے دوسری لڑھکن تک لیجانے کا پروگرام ووڈ ہاؤس یہ ناٹک کا پروڈیوسر‘ ڈائریکٹر (ڈور تھامنے والا) اور ناظر بھی ۔ اپنا ہیرو نئے تنازعہ میں پھنس گیا کہ پہلے اُسے ہی خوشی ہوتی ۔ پھر اُس کا ڈائرکٹر (ڈور تھامنے والا) خوش ہو کر اُس کی فضیحت کا تذکرہ مزے دار لفظوں میں کرنے کے لئے بیقرار رہتا۔ ایک آدھ ایسی مناسب تشبیہ نکل آتی کہ وہ سوجھنے پر مجھے لگتا ہے خود ووڈ ہاؤس گد گدی ہونے کی طرح ہنستا ہوگا۔ صفحے صفحے پر ایسی کتنی مزاحیہ تشبیہیں، عمدہ شعروں (نظم) کی طرح بالکل بدلے نہ جاسکیں ایسے الفاظ کا انتخاب ۔ ایک بات البتہ یقینی کہ ووڈ ہاؤس سے اسکی انگریزی میں ہی لطف اندوز ہوا (ہونے کا تجربہ کیا) جاسکتا ہے ۔ ترجمے میں اس کے اسلوب پر گرفت نہیں آتی ۔ طبلے کی تھاپ پر ’’ دھا ‘‘ یعنی وہاں ’’ دھا ‘‘ ہی ہونا چاہیئے ’’ دِھن ‘‘ نہیں چل سکتا ‘ ویسا ہی ووڈ ہاؤس کے لطائف کا ہے ۔ ترجمہ یوں دیکھیں تو یہ ایک سہولت ہے ۔ ووڈ ہاؤس پڑھتے ہوئے اس کا احساس بدرجہ اتم ہوتا ہے ۔ اُس کا وہ ’’ جیوز ‘‘ یہ ’’ بٹلر ‘‘ ہے اب ’’ بٹلر ‘‘ یہ لفظ جاپانی ’’ گیشا ‘‘ یا دور کیوں جائیں ’’ بھجّی بُوا ‘‘ یا ’’ سپھلے ‘‘ کی طرح ہی ناقابلِ ترجمہ ہے ۔

اُس کی انگریزی زبان کو حسبِ خواہش کھیلنے لگانے کا چونچلا پنڈت ۔ غیر از پنڈت سبھوں کو تھا۔ ۱۹۳۹ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی نے ووڈ ہاؤس کو انگریزی ادب کی خدمات کے لئے ڈی لِٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی ۔ اس سے قبل مارک ٹوین اس مزاح نگار کو اعزازی ڈاکٹریٹ دی گئی تھی ۔ اپنے یہاں کی

یونیورسٹیوں سے البتہ مزاح نگار کواعزازی ڈاکٹریٹ عطا کرنا یہ عام طور پر کسی کو بھی بہترین تندوری چکن تیار کرتا ہے اس لئے ''شال اور ناریل'، دینے جتنی ناممکن حدوالی بات ہے۔

۱۹۳۹ء میں انگلینڈ میں ووڈ ہاؤس کے مزاح کو اتنے بڑے پیمانے پر اعزاز حاصل ہوا اور سال دو سال ابھی بیتے بھی نہ تھے کہ زمانۂ جنگ کا غدّ ارِ وطن کہہ کر احتجاج شروع ہوا۔ جس کے قارئین میں رُڈ یارڈ کلپنگ، آگاتھا کرسٹی، جارج آرویل، مالکم مگرز جیسے انگریزی ادب کے عظیم قلم کار تھے۔ ہلیر بیلاک جیسے انگریزی مصنف نے جس کی ''فی الوقت بقیہ حیات مصنفوں میں بلاشبہ سب سے بہترین مصنف'' کہہ کر بی بی سی نے تحسین کی، اُسی ووڈ ہاؤس پر اُسی بی بی سی پر، پانچویں درجے کا، غدّارِ وطن، لارڈ ہاہا ایسی بدنامی شروع ہوگئی۔ خاص کر اس وقت کے برٹش وزیر نشر واشاعت ڈف کوپر نے توذاتی بیر ہوایسی کردار کشی کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ البتہ برلن ریڈیو پر نشر کی گئیں جن تقاریر کی بنا پر اُسے غدّ ارِ وطن قرار دیا گیا تھا اُن تقریروں سے متعلق کہ وہ تقریریں کیا تھیں، جانکاری حاصل کرنے کی کسے بھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ یعنی ایک طرف ووڈ ہاؤس نازی جرمنی کے قید خانے میں صعوبتیں جھیل رہا تھا اور اُسکے مادرِ وطن میں اُس کے خلاف اُس کے جرمن نوازی کے لئے زہر اُگلا جارہا تھا۔ یہ بے گناہ و معصوم شخص غدّاری کرے گا ہی کیوں، یہ خیال اُسے موردِ الزام ٹھرانے والوں کے من میں لمحے بھر کے لئے نہ آئے اسے کردار کشی کی بے ربط تشہیر کی فتح قرار دینا چاہیئے۔

پر ایسی اس بھیانک حالت میں ووڈ ہاؤس نے لیکن صبر وضبط پر کسی قسم کا اثر نہ لاتے ہوئے اس نے جو ہمّت و استقلال کا مظاہرہ عوامی سطح پر کر دکھایا وہ دیکھنے کے بعد ظاہری طور پر مزاح تقسیم کرنے والا یہ شخص کتنا قدآور اور کتنا گہرا ہے اُس کا ثبوت مل جاتا ہے۔ الگ الگ جیلوں میں اور نظر قید جگہوں کے کیمپ میں لیجا کر محصور کئے ہوئے ووڈ ہاؤس کی ظرافت لمحے بھر کے لئے تک اُسے چھوڑ کر نہیں گئی۔ وہ زمانۂ نظر قید کے تجربات کی مزاحیہ ڈائری لکھ رہا تھا۔ مزاحیہ ناول کے پیچ وخم تیار کر رہا تھا اُسے سلجھا رہا تھا۔

فاقہ جاری تھا۔ کڑاکے کی سردی میں ساٹھ کی عمر کو پہنچے ہوئے ووڈ ہاؤس کو فرش پر سونا پڑتا تھا، بیت الخلاء صاف کرنے پر مجبور کیا جارہا تھا اور ''مزاحیہ تخلیق'' یہی ایک اپنے بس کی بات ہے ایسا سمجھنے والا پلم لوگوں کو ہنسانے

والے صفحات پر صفحات لکھتے جا رہا تھا۔ ہم ''میرا دھرم'' کی ڈینگیں ہانکتے ہیں۔ ووڈ ہاؤس اُسے نبھاتا تھا۔ مزاحیہ تخلیق یہ اُس کا ''میرا مذہب'' تھا۔

دوسری جنگِ عظیم کے وقت ووڈ ہاؤس فرانس کے پلاز کے قریب سمندر کے کنارے والے ''ل ٹکے'' نام کے چھوٹے سے گاؤں میں رہائش پذیر تھا۔ ۱۹۴۰ء کے ماہ مئی میں نازی جرمنی والوں نے 'ل ٹک' پر قبضہ کرلیا اس گاؤں میں جتنے انگریز تھے۔ انھیں خود کے ہی گھر میں نظر قید کر دیا گیا تھا۔ ہفتے میں ایک بار جرمن کمانڈنٹ کے دفتر میں حاضری دینا پڑی تھی۔ ایسی صورتِ حال ہونے کے باوجود اس کے خلاف پروپیگنڈا کرنے والوں نے '' ووڈ ہاؤس کو پکڑنے کے لئے نازی فوجی آئے اس وقت اس کے گھر میں پارٹی چل رہی تھی۔'' وغیرہ جھوٹی خبریں پھیلا دی تھیں۔ نازی فوجی زبردستی لوگوں کے گھر میں گھس کر ان کے حمام میں غسل کرتے، کھانا برباد کرتے، اس حقیقت کے برخلاف، نازی فوجیوں کو اپنے غسل خانے میں نہانے کا انتظام کر کے ووڈ ہاؤس انھیں پارٹی میں مدعو کرتا تھا، ایسا پرچار بھی کیا جاتا تھا۔ ووڈ ہاؤس کہتا تھا۔ ''اِن حرام خوروں کو اپنے گندے جسم دھونے ''میرے باتھ روم میں آؤ'' ایسی دعوت دونگا کیا؟ میں نے انھیں ڈانٹ کر بھی دیکھا۔ کیسا دم اور کیسا کچھ! دوبارہ آئے تو اور بھی فوجی ساتھ لے کر گھس گئے!''۔ فرانس نے اپنی خود سپردگی لکھ کر دے دی تھی۔ باہری دنیا کی خبریں سننے والوں پر پابندی تھی۔ انگریزی اخبار آنے نہیں دیا جاتا تھا۔ فاسسٹ حکومت میں، خبروں کا بلیک آؤٹ، یہ ایک موثر ہتھیار ہوا کرتا تھا۔ اور گوویلس جیسا مخالف اشتہار کرنے والوں کے کا استادوں کا استاد رہنے کے بعد اس کے پروپیگنڈا میں کیا ظاہر کیا جاتا اور کیا پوشیدہ رکھا جاتا تھا اس کا تصوّر کرنا بھی ناممکن تھا۔

ووڈ ہاؤس حسبِ معمول اس جرمن کمانڈر کے دفتر میں ۲۰ جولائی کو حاضری دینے گیا لیکن فضا الگ لگی۔ 'ل تک' میں رہائش پذیر سارے پردیسی مردوں کو نظر قید کرنے کا حکم صادر کیا گیا تھا۔ ''ضرورت کی جو چیزیں ہونگی وہ بیگ میں بھرلو اور فوراً تھانے پر حاضر ہو جاؤ'' ایسا حکم آیا تھا۔ وہاں سے انھیں جرمنی کے کانسنٹریشن کیمپ میں لے جانے والے تھے۔ ووڈ ہاؤس کے لفظوں میں کہیں تو '' نظر قید کا پیشگی تجربہ نہیں تھا۔ اس لئے بیگ میں کیا کیا رکھا جاتا ہے اس کا علم نہ تھا۔ اِس لئے پائپ، تمباکو، پینسلیں، بیاضیں، بوٹ، داڑھی کا

سامان، ٹھنڈی کے لئے سویٹرس، ٹینس کی نظموں کا مجموعہ، مکمل شیکسپئر کا سیٹ، اور آدھا پونڈ چائے کی پتی۔ اتنا سامان بھر دیا۔ اِتنے میں ایتھل نے اس بیگ میں کولڈ مٹن چاپ اور چاکلیٹ سلیپ گھسا دیا۔ رتل بھر لونی لوایسا کہہ رہی تھی۔ لیکن دھوپ میں لونی پگھل جانے کا تھوڑا سا خدشہ تھا اس لئے وہ ارادہ ترک کر دیا۔'' ایتھیل سے الوداع کہہ کر گھر چھوڑ دیا۔ یہاں سے اسے سال بھر خوب پریشانی ہوئی۔ ساٹھ سال سے جنگی قیدیوں کو قید میں نہ رکھا جائے اس قانون کے تحت اس کا چھٹکارا ہوا۔ اس نظر قید کے زمانے پر ایک امریکی براڈ کاسٹنگ کمپنی نے اسے تقریریں کرنے پر لگا دیا۔ وہ یہ ''برلن براڈ کاسٹ'' جرمنوں نے دھوکے سے اس کا غلط استعمال کیا اور انگریز اپنی حس ظرافت رہن رکھ کر غصّے میں آ گئے۔ دراصل بھڑکنا چاہیئے تھا، جرمن والوں کو لیکن زمانۂ جنگ میں ریڈیو سے ووڈ ہاؤس کیسے بولا؟ بس! یہ ایک سبب لیکر وہ کیا بولا وہ دھیان میں نہ لاتے ہوئے اس پر کیچڑ پھیکنے کا سرکاری پروپیگنڈا شروع ہوا۔ اسے فاسسٹوں کا بغل بچہ کہا جانے لگا۔

جنگ بند ہوگئی۔ جرمن ہار گیا۔ سب کے دماغ ٹھنڈے ہوئے اور ۱۹۵۴ء سال میں ووڈ ہاؤس نے اُن تقریروں کو اپنے دوست ٹاؤن اینڈ کو شائع کرنے کی اجازت دی۔ اس دوست کو ووڈ ہاؤس نے عمر بھر بڑے مزیدار خط لکھے ٹاؤن اینڈ یہ بذاتِ خود اچھا قلم کار۔ اسنے وہ سارے خط سنبھال کر رکھے اور شائع کئے۔ سی ان او کیسی نام کے مصنّف نے ووڈ ہاؤس کو انگریزی ادب کی '' پرفارمنگ فلی ''....... یعنی ''بازی گیری کرنے والی مکھی۔ مختصر یہ کہ '' تماشہ بین'' کہا ہے۔ اس خطوط کے مجموعہ کا نام وہی رکھا۔ میں تماشی گیر ہوں ووڈ ہاؤس نے خود تسلیم کیا اور نہ جانے وہ جو خامی جان کر کیا ہوگا اسے خوبی کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اُس ہنسانے والے شخص کو دوسرے کسی اعزاز کی خواہش نہ تھی۔ بھرپور کیچڑ اچھالا گیا تھا لیکن پلم کے ناول کے برابر شائع ہو رہے تھے۔ برٹی اوسٹر بار بار حرکت کر رہا تھا۔ اس کا وہ مستحکم (اور ثابت قدم) جیوز اطمینان سے مالکوں کو ان سے چھڑالاتا تھا اور اتنے ہی اطمینان و سکون سے الگ تھلگ ہو جاتا تھا۔ لوگ پڑھتے تھے، ہنستے تھے۔

جنگ ختم ہو کر پانچ سات سال بیت جانے کے بعد اُس کی کتابوں پر بھرپور توصیفی تبصرے میں ''ووڈ ہاؤس کی مزاح نگاری کا نعم البدل نہیں'' ایسی سفارش کی جا رہی تھی۔ لیکن فوراً دوسری جنگِ عظیم

میں نازیوں نے اُسے پکڑ کر اُپر سائی لےشین جیل سے برٹش جرمنیوں سے پناہ مانگیں اس غرض سے کئے گئے پرچار کے بُرے خواب جیسے دن اور وہ بُرے خواب جیسی یادیں اب ختم ہو چکی ہیں۔'' یہ دم جُڑی ہوئی تھی ہی۔

'' اَستیہ میو جَیتَے'' کی بہترین مثال ہے۔ پلم نے یہ تبصرہ پڑھا۔ اس پر اس کا ردِ عمل اس کے مزاحیہ مزاج پر جچنے والا ہے۔'' بارہ سال قبل میں نے جب میں ساٹھ سال کا کنکر تھا اس وقت اس بیان کا زخم ہوا ہوتا۔ اب ستر سال کی عمر گذر جانے کے بعد ایسے وار کے زخم نہیں پڑتے۔ اب اس گھڑیال کی ٹک ٹک کسی وقت بند ہو گی کہا نہیں جا سکتا۔ ایسے وقت کسی بھی چیز کا دکھ سنبھالنا دیوانہ پن لگتا ہے..........لوگ میرے بارے میں اخباروں میں چاہے جو بھی لکھیں۔ جب تک وہ میرے نام کے سپیلینگ غلط نہیں کرتے تب تک اس کا مجھے احساس نہیں ہوتا۔ ایسا کہتے ہیں کسی نے کہا تھا۔ میرا حال اس شخص جیسا ہے۔ مقصد یہ کہ، میرے متعلق یہ غلط فہمی اگر لوگوں کے اڈّے اڈّے پر چلنے والی ہو تو '' برلن براڈ کاسٹ'' کو شہرت ملی اس میں بھی کچھ نقصان ہونے والا نہیں ہے۔''

اور مزے کی بات یہ ہے کہ برلن براڈ کاسٹ یعنی جن جرمنوں نے پلم کو نظر قید کر رکھا تھا اُس کا دراصل بھرپور مذاق ہے۔ فاقہ کشی اور تکالیف پر وہ طنزیہ تقریریں یعنی ایک مثال ہے۔ جرمنوں میں اس کی چبھن سمجھ میں آئے اتنی مزاحیہ حِس نہیں تھی یہ ووڈ ہاؤس کی خوش قسمتی۔ ورنہ انھوں نے کب کا اُسے سولی پر چڑھا دیا ہوتا لیکن تعجب ہوتا ہے تو وہ انگریزوں کے حِس مزاح کے ختم ہو جانے کا۔ ہٹلر نے اس حد تک تو انگریزوں پر فتح حاصل کی تھی کہنا چاہیئے۔ اُن کا ایک مزاح نگار دشمن کے ملک میں رہ کر دشمنوں کا بے حد مذاق اُڑا رہا تھا اور وہ محض اس لئے کہ دشمن کے ریڈیو پر سے وہ تقریریں نشر ہوئیں اسے دشمن کا پرچار قرار دیا گیا تھا۔ ووڈ ہاؤس کی اِن انگریزی تقریروں کا ترجمہ کرنا یقیناً مشکل ہے۔ اس کے باوجود ایسی اس حالت میں اس نے حسِ مزاح کو سنبھالے رکھا تھا اِس کی جھلک دکھائی دیتی ہے یہ بے مثل ہے۔ اُن تقریروں کی ابتدا ہی کتنی دلچسپ ہے۔

'' میرے سامعین کو میرے بولنے میں اگر تھوڑا بہت جاہلانہ انداز ملے تو وہ برٹی بوسٹر کے لفظوں میں کہیں تو فوراً واضح کرنے کی ضرورت رہنے والی جیسی ہے۔ میں ابھی ابھی جرمنی میں ۴۹ ہفتوں کے مختلف جیلوں کی سیر کر کے نکلا ہوں۔ مطلب' یہ دوسرا شخص پہلے جیسا نہیں رہا'' یہاں سے آگے پلم نے اپنی پانچ تقریروں میں

زمانۂ قید و بند کی صعوبتوں کو مزاح کے رنگ میں رنگ دیا ہے جرمن کمانڈ کے دفتر (تھانے) سے اس کا گھر تین چار کلومیٹر دور تھا۔ بیگ لینے کے لئے جرمن افسروں نے اُسے پانچ منٹ کی مہلت دیکر فوجی گاڑی میں بٹھا کر گھر تک لے گئے۔ ووڈ ہاؤس کہتا ہے۔

''موٹر گاڑی میں لیجانے کی وجہ سے مجھے لگا جرمن لوگ مجھ سے خوش ہوں گے۔ گھر پہنچ کر ٹھنڈے پانی کا شاور باتھ لیا جائے۔ پائپ سُلگا کر بیگ میں رکھنے کی چیزوں پر غور کیا جائے ایسا خیال تھا۔ البتہ میرے ساتھ آئے ہوئے جرمن فوجی نے ''جلدی سمیٹئے'' کہکر چلاتے ہی میرے ولولے پر پانی پھر گیا۔ اُس کے خیال میں پانچ منٹ کافی تھے۔ بالآخر دس منٹوں پر سمجھوتا ہوا ـــــ میری مستقبل میں کردار نگاری کرنے والے اِسے نوٹ کرلیں۔ اس سے آگے کچھ دن نظر قید میں گذارنے ہیں یہ خیال آتے ہی پہلی بات جو میرے ذہن میں آئی وہ یہ کہ اب کمر کس کر شکسپیئر کی جملہ تخلیقات پڑھ لی جائیں۔ پچھلے چالیس برسوں سے میں مکمّل شکسپئیر پڑھنے کی پلاننگ کر رہا ہوں۔ تین سال پہلے اسی مقصد سے آکسفورڈ ایڈیشن بھی خرید لیا تھا لیکن ''ہیملیٹ'' اور ''میک بیتھ'' کا مطالعہ کرکے ''ہینری دَ ایٹتھ'' حصّہ اوّل' دوّم اور سوّم کا مواد ذہن نشین کر سکوں اس سے پہلے آگا تھا کھرِستی کی امید وبیم (suspence) کہانیوں کے کسی نہ کسی بات کی طرف دھیان مبذول ہو جاتا اور پڑھنے کا کام آگے ڈھکیلنا پڑتا۔ یہ نظر قید کی حالت چند سالوں کے لئے تھی یا ہفتوں کے لئے تھی اس کا کوئی علم نہ تھا لیکن بطور مجموعی حالت البتہ مکمّل شیکسپئر کی طرف نشاندہی کر رہی تھی اس لئے وہ بیگ میں گھس پڑا۔ اس گڑبڑ میں ووڈ ہاؤس ایک ہی چیز بیگ میں رکھنا بھول گیا تھا وہ تھا اس کا پاسپورٹ۔

بیگ بھر کر ہوگئی تو پھر سے ایک بار پلم کو اس جرمن کمانڈر کے سامنے کھڑا کر دیا (اس کمانڈر کی ایک آنکھ کانچ کی بٹھائی ہوئی تھی۔ اُس آنکھ کا ووڈ ہاؤس کو بہت ڈر لگتا تھا ایسا اُس نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے) وہاں بھرپور وقت بے حس وحرکت ہو جانے کے بعد ووڈ ہاؤس کا سفر شروع ہو گیا۔

اس نظر قید کے زمانے میں کئے گئے سفر میں بڑی تپش رہتی ہے۔ ہمیں کہاں لئے جا رہے ہیں کچھ پتہ نہیں چلتا۔۔۔ یعنی ہم پڑوسی گاؤں میں آئے یا آدھا یورپ اُلٹ دیا اس کا اتہ پتہ نہیں چلتا۔۔۔ ہمیں لیل نام کے شہر میں لوس نام کے مضافات میں لے گئے تھے۔ ستر میلوں کا فاصلہ۔ پر راستہ میں نظر قیدوں کے

دوسرے ''ارکانِ منتظمہ'' کو بھی ساتھ لینا ہوتا ہے اس لئے اتنا راستہ پار کرنے میں سات گھنٹے لگے۔''

اُس بس میں لَ یّکے گاؤں کے جو دوسرے انگریز پکڑ کر گھسا دئے گئے تھے وہ سب اُس کی پہچان کے تھے۔ آگے کیا پروس کر رکھا گیا ہے اس کی کسے بھی خبر نہ تھی۔ نظر قید ہونے کا یہ ہم سب کا پہلا تجربہ۔ لیکن ہر کوئی اپنا اپنا دماغ لڑا کر اندازہ کر رہا تھا۔ ہمارا آل جی یعنی انسانی شکل میں سورج کی کرن! نا امیدی کا اندھیرا اُسے نامنظور۔ ہم سب کو گرمی کی تعطیل میں رہنے کی سہولت، بڑے لوگ باغیچوں میں بڑے آنگن کے ساتھ بنگلے تعمیر کرتے ہیں' ویسے بنگلے میں کی جائیگی ایسی اس کی پیش گوئی تھی۔ بنگلہ؟ میں برابر۔ بنگلہ آل جی یعنی اگلے برآمدے میں پیلے پھولوں کی بیلیں وغیرہ چڑھائی ہوتی ہیں اس طرح کے۔۔۔ بیلوں کا یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔۔۔ ہو بھی سکتی ہیں یا نہ بھی ہوں۔ لیکن آنگن کیاریوں والے بنگلے میں ہوگا یہ یقینی بات ہے۔ پھر ہمیں پیرول پر چھوڑ دیں گے۔ دن بھر بن جنگل میں گھومنے کی اجازت رہیگی۔ مجھے لگتا ہے ہُک ڈال کر مچھلیاں پکڑنے بھی دیں گے۔ کچھ دیر کے لئے بس کا ماحول خوشگوار بن گیا مچھلی پکڑنے کا کوئی خاص شوق نہ رکھنے والے کہنے لگے' ہم اپنے دھوپ میں گھوم پھر آئینگے۔

کچھ دیر بعد دھیان آیا کہ آل جی کو نظر قید کی الف ب معلوم نہیں۔ بنگلے ہی میں رکھنا ہے تو پھر ہمارے بنگلے کیا بُرے تھے ؟ خواہ مخواہ ہمارے خود کے بنگلے سے اُٹھا کر لیجا کر دوسروں کے بنگلوں میں ایکدم رہائش دی جائے اس کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے بعد لیکن ضرور ہم ٹھٹھرتے گئے۔ آشاواد کی جگہ بے چینی نے لیتے ہوئے اور لیل گاؤں کو موڑ لے کر ایک بھیانک عمارت کے سامنے جس وقت ہماری بس کھڑی ہوگئی اُس وقت ہمارے جوش خروش کے پارے نے صفر سے نچلا نیا درجہ حاصل کیا تھا۔ وہ عمارت یعنی مقامی جیل یا علاقائی قید خانہ کے علاوہ اور دوسری کوئی نہیں ہوگی یہ واضح ہو چکا تھا۔ ایک فرینچ مستقل سپاہی نے دروازے کھولے اور ہم اندر داخل ہوئے۔

اب اس تقریر میں کہاں سے وطن سے غدّاری آئی ! لیکن برٹش وزیر نشر و اشاعت کو وہ نظر آئی۔ برلن ریڈیو پر کی گئی ایسی دس دس منٹوں کی پانچ تقریریں یعنی کل پچاس منٹ۔ انسان کو نظر قید کر کے اس کی آزادی چھین تو سکو گے لیکن ان صعوبتوں کا مذاق اُڑانے کی اس کی قوّت کیونکر چھین سکو گے؟ ووڈ ہاؤس نے قید و بند

کا حال جس طرح بیان کیا ہے اس کا لبِ لباب توانوکھا ہے۔ ووڈ ہاؤس کہتا ہے۔ ''جنھوں نے اب تک قید و بند کی صعوبتیں نہیں جھیلیں اُنھیں بھلائی کی خاطر ایک بات کہنی ہے۔ خاص طور پر یہ کہ ایسے اداروں میں داخلہ حاصل کرنا مشکل کام نہیں ہے۔ کسی بڑے ہوٹل میں کمرہ ریزروکر کے رکھنے جیسا ہی ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا کہ دروازے کے پاس شعبۂ استقبالیہ میں پھولوں کے گملے وغیرہ نہیں رہتے۔ خود کی بیگ خود ہی اُٹھانی پڑتی ہے --اور خدمت گار کوٹِپ دینے کی ضرورت نہیں رہتی۔

بچپن سے پاک بے عیب زندگی گذارنے کی وجہ سے، جیل کا اندرونی حصّہ صرف سنیما میں دیکھا ہوا تھا۔ اتنے میں میری نظر شعبۂ استقبالیہ میں بیٹھے ایک افسر سے ٹکرائی۔ اور مجھے افسوس ہوا۔ زندگی میں کبھی ایسا لمحہ آتا ہے جب ہماری نظر کسی ناآشنا شخص کی طرف جاتی ہے اور ہمیں محسوس ہوتا ہے۔ واہ !۔ دوست مل گیا' یہ لمحہ اس قسم کا نہ تھا۔ ''شیطان کا آئلینڈ'' والے سنیما جیسا وہ شخص مجھے دیکھکر اپنی مونچھوں پر تاؤ دے رہا تھا۔ لیکن قلم کار کی نسل ایک جھٹکے میں مایوس نہیں ہوتی۔ من میں یوں ہی ایک دھندلا سا خیال رونما ہو رہا تھا--- ہمیں مہمان نوازی کے لئے بلانے والا ہمارا یہ میزبان میرا نام سنتے ہی ایکدم ''اُئی ماںیے وود ہاؤس!''-- اینبرے--ازے- میرتر- ایسا کچھ بھی بڑبڑاتا اُٹھ کھڑا ہوتا۔ رات سونے کے لئے چاہے تو میرا پلنگ لے لو کہے گا 'ٹھیک، کیا بتاؤں صاحب' میں آپ کا بے حد چاہنے والا ہوں---ہماری بچّی کے لئے آٹوگراف دیں گے کیا؟---ایسا کچھ کہے گا۔

البتہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس نے ایک بار مونچھوں پر تاؤ دیا۔ ایک بڑے سے رجسٹر میں میرا نام لکھ دیا۔ وِڈہارس'---گناہ اس کالم میں' انگلش 'ایسا درج کر دیا۔

قریب موجود سپاہیوں کو ''اسے کوٹھری میں لیجا کر ڈال دو'' ایسا حکم دے دیا۔ وہ کوٹھری میں آل جیز بار کا آل.جی (بنگلے میں رکھینگے کہنے والا) اور ہمارے گاؤں والا سالس اور ہر دل عزیز پیانو ٹیونر ولیم کا میل ایسے تینوں کو ملا کر دی گئی تھی۔ باقی وقت کیا ہوگا بھگوان جانے لیکن زمانۂ جنگ میں ہر کوٹھری میں تین لوگوں کو رکھتے تھے۔

کوٹھری کا رقبہ ۱۲ x ۸ فِٹ۔ سنیما کی کوٹھریوں میں رہتے ہیں ویسی سلاخیں وغیرہ نہیں تھیں۔ ایک ہی بڑا لوہے کا دروازہ اس میں کھانے کی تھالی سرکانے کے لئے جگہ اور اندر کے قیدی سلامت ہیں یا نہیں یہ

دیکھنے کے لئے باہر کے پہرہ دار کے لیئے دروازے پر باہر سے ایک ڈھکن لگا ہوا سوراخ۔ اُس کوٹھری میں صرف ایک چارپائی اور اس پر بچھونا۔ اُس ایک دیوار کی اوپری جانب ایک کھڑکی تھی۔ دوسری دیوار کے پاس ایک چھوٹا سا ٹیبل۔ اُس سے ہی زنجیر سے باندھی ہوئی تین ساڑھے تین بالشت اونچی کرسی۔ کونے میں نل تھا اُس کے نیچے رکابی جتنا واش بیسن۔ لکڑی کا ایک شیلف اور دیوار میں ایک لکڑی کی کھونٹی۔۔۔۔ مختصر یہ کہ مکمل زیب و زینت ماڈرن اسٹائل کی۔ چونا لگائی ہوئی دیواروں پر جو تصاویر تھیں وہ اُس کوٹھری میں رہنے والے فرینچ قیدیوں کی نکالی ہوئی تھیں۔ یہ سمجھ میں آتا تھا اُنھوں نے پینسل سے واضح انداز میں نکالی ہوئی تصویروں سے اُن فرینچ قیدیوں کی فنِ مصوّری سے متعلق اعلیٰ معیاری سوچ نہ تھی واضح ہوتا تھا ۔۔۔۔ چاروں طرف وہ اُس طرح کی تصویریں ہونے کی وجہ سے ''پیرس والی رنگیلا رسول'' جیسی کتاب کے صفحات کے بیچ پھنسے ہوئے ہیں ایسا اثر ہوتا۔

ہم تینوں میں کارٹ میل عمر میں بڑا۔ اُسے ہم نے چارپائی دی اور ہم زمین پر دراز ہو گئے۔ پتھر کی زمین پر سونے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ لیکن دن بھر بلند ہمّتی کے بعد آنکھ لگ جانے میں دیر نہیں لگی۔ نیند آنے سے پہلے کا مجھے ایک ہی خیال یاد آتا ہے۔ ڈھلتی عمر میں شریف انسان پر ایسا سانحہ گذرنا بھیانک ہے یہ ضرور۔ لیکن اس میں بھی ہونہ ہو لطف آتا تھا اور اپنے حصّے میں کل کیا آنے والا ہے اس کا انتظار کرتا رہتا۔''

اس قید و بند کے کھانے پینے کی تکالیف کا ذکر ووڈ ہاؤس بڑے ہی مزے سے کرتا ہے اور وہ مزے سے کیا ہے اس لئے ووڈ ہاؤس اُس زمانہ حبس میں بہت مزے کی زندگی گذار رہا تھا ایسی اُلٹی شہرت کرنے کا موقع اُسکے مخالفین کے ہاتھ لگ گیا اس طرح فاقہ کرنے والے شخص نے ''جیل میں ہم نے ٹھنڈا ناشتہ کھایا'' کہا ہو اُس کے مخالفین نے اُنھیں جیل میں کُلفی ملائی، فریج کے دہی بڑے دئے جاتے ہیں ایسی تشہیر کرنے جیسا ہے قید کے زمانے میں ناشتہ میں ان تینوں کو تین پیالے سوپ اور چھوٹے تین پاؤ ملتے تھے۔ ووڈ ہاؤس کہتا ہے'' سوپ ٹھیک تھے۔ اُس کے ساتھ کس طرح نباہ کیا جا سکتا تھا۔ پہلا ٹکڑا کھانے پر جو لذّت ملتی تھی وہ سچ مچ ویسی ہی تھی اُس کا سمجھنا بھی ممکن نہ تھا۔ ٹیبل کے لکڑی کے ٹکڑے اُڑنے لگتے۔ لیکن اندازہ دوسرا ٹکڑا لینے سے پہلے ختم ہو جاتی۔ پر چھری بنا پاؤ کس طرح کاٹا جائے! ٹکڑا ٹکڑا کترا جائے تو پھر میری کوٹھری کے ساتھی کے دانت

اُن کے لڑکپن میں ہی بیکار ہوئے تھے۔ہاں !اگر اُس ٹیبل پر پاؤ پٹکا جائے تو وہ مشکلات میں راہ ضرور نکل آتی ہے میرے پاس پاؤ توڑنے کی اجتماعی ذمہ داری آگئی (لکڑی توڑنے کی طرح) اور مجھے لگتا ہے میں نے وہ تسلّی بخش طریقے سے انجام دی۔ کچھ بھی کیوں نہ ہو میں اُس چیز کے حصّے کر سکتا ہوں۔اس کا طریقہ یہ ہے گردن کا زاویہ قائمہ بنایا جائے اور دانتوں کے اوپری صف پر یہ سخت کام سونپ دیا جائے۔

ایک بار وہ اس طرح شل امرت سوپ اُبالنے والے باورچی کی اور ووڈ ہاؤس کی اُس قید خانے میں ملاقات ہوئی۔ ووڈ ہاؤس نے ڈائری میں لکھا ہے۔

''آج طباخ سے ملاقات ہوئی۔سوپ کے لئے میں نے اُسے مبارک باد دی' سوپ کم پڑتا ہے' ایسی قیدیوں نے شکایت کی کرنے کی وجہ سے اُس کے پیشہ ورانہ غرور کو ٹھیس پہنچی تھی۔'' مجھے کیا پانی ملا کر سوپ پروسنے نہیں آتا تھا؟۔لیکن وہ میرے فن سے بُرا سلوک کرنے جیسا ہوتا'' باورچی جی میں نے کہا درست ہے۔ ہمارے پیشے میں بھی وہی ہے ۔ کتھا یعنی کتھا۔اُسے پھُلا کر ناول بنایئے۔لطف ہی چلا جائیگا ۔

اِس کوٹھری سے نظر قیدیوں کو' کھلی ہوا' تفریح اور ورزش کی غرض سے صبح ساڑھے آٹھ بجے باہر نکالتے اور چاروں طرف اونچی دیوار اور آسماں کی جانب تھوڑا بہت کھلا ہو، ایسے حصار میں لیجا کر آدھا گھنٹہ کھڑا کرتے۔ وہ حصار کلکتہ کا بلیک ہول دیکھے ہوئے اور اُس کو بے حساب سراہنے والے آرکیٹیکٹ نے رچا ہوگا۔ یقیناً ووڈ ہاؤس نے کوٹھری میں اُٹھائے جانے والے سارے مصائب کا اس نے مذاق اُڑایا ہے۔جرمنوں کے قبضے میں اُن فرینچ قید خانوں کی کوٹھریوں کی گندگی کا ذکر کرتے ہوئے ووڈ ہاؤس کہتا ہے۔

ہمارے ۴۴ نمبر کے کمرے کی گندگی کیسے مضبوط قد آور چوڑے کاندھوں والے زیر ترتیب جوانوں جیسی تھی ہمیں اُس گندگی سے اُنس ہوگیا۔فخر ہونے لگا۔ دوسری گندگی کے مقابلے میں اُس کی طاقت اور درجہ اِن خوبیوں کی برتری کی بابت ہم دوسرے قیدیوں کے ساتھ شرط لگانے لگے اور جس وقت ہمارے کمرے میں داخل ہوا اور گندگی کی بدبو کی وجہ سے فوراً پیچھے ہٹ گیا اُس وقت تو ہمیں ذاتی طور پر اعزاز بخشا گیا ہے ایسا محسوس ہوا

اُس حصار کی آدھ گھنٹے کی کھلی ہوا وغیرہ چھوڑ دی جائے تو اس کوٹھری میں ان تینوں کو ان کے باقی ماندہ ساڑھے تیئس گھنٹے بتانے پڑتے۔اُس تجربے کا بھی ووڈ ہاؤس مزاحیہ انداز میں حساب پیش کرتا ہے۔

''مکمل شیکسپئر کی وجہ سے میرا تو ٹھیک تھا لیکن بار چلانے والے آل جی کے ہاتھوں کے پاس کاک ٹیل بنانے کے لئے دارو نہیں تھی اور کانیل کے پاس ٹیوننگ کرنے کے لئے پیانو نہیں تھا۔ باقی آس پاس پیانو نہ ہونے والے ٹیونر کا حال طبّی مشورے کی بنا پر شاکاہاری (سبزی والے کھانے) خوراک پر رکھے ہوئے شیر جیسی ہی کہنا ہوگا۔ کچھ دن اُس قید خانے میں گزارنے کے بعد ایک دن کمانڈر آیا اور بولا۔ ''تمھارے کاغذات کی جانچ ہو جانے کے بعد ، یہاں سے ہلا دیا جائے گا اس لئے تیار رہو''۔

جو ساٹھ سے زائد عمر کے ہوں گے اُن کو رہا کر کے گھر بھیج دیا جانے والا تھا۔ بل کارمیل اور اُن کی عمر کے دوسرے لوگوں نے دوسری قطار بنالی۔ میری عمر پونے اُنسٹھ سال ہونے کے ناطے میں بھی اُس طرف کھسک گیا۔ لیکن مجھے ''پیچھے ہٹو'' کر دیا۔ پونے اُنسٹھ وغیرہ اچھا ہے لیکن جتنا اچھا ہونا چاہئے اُتنا نہیں ہے ۔۔ اِس طرح مجھے سمجھا دیا گیا۔

دوسرے دن گیارہ بجے سوپ پلا کر سارے قیدیوں کو ایک وین (گاڑی) میں گھُسایا گیا اور ایک ریلوے اسٹیشن پر لے آئے۔ووڈ ہاؤس کہتا ہے۔'' وہاں کی دوڑ دھوپ اور گڑبڑ دیکھ کر گاڑی ساڑھے گیارہ بجے چھٹے گی یہی اندازہ کیا ہوتا کسی نے۔ پر ویسا کچھ بھی نہیں تھا۔ ہمارا یہ کمانڈر جوان بہت ہی محطاط معلوم ہوا مجھے لگتا ہے کسی وقت اس کی گاری چھوٹ گئی ہوگی اور اس واقعے کا اس کے دل پر اثر ہو کر اُس کی گانٹھ پڑ گئی ہوگی۔ صبح ۲۰۔۱۱ کو اُس نے ہمیں اسٹیشن پر پہنچا دیا اور گاڑی رات کو آٹھ بجے روانہ ہوئی۔ ہمیں پہچاننے والا سارجنٹ لوٹ جانے پر اُس میں اور کمانڈر صاحب میں جو بحث ہوئی ہوگی اُس کا تصوّر کیا جا سکتا ہے۔

''کیوں گاڑی اچھی طرح پکڑنے ملی نا!'' کمانڈر

''ہاں صاحب! آٹھ گھنٹے اور بیس منٹوں پر''۔ سارجنٹ

باپ رے تھوڑے میں ہی مل گئی۔ اس سے آگے اتنے عین وقت جا کر نہیں چلیگا''

صبح صرف پیالہ بھر سوپ پلا کر قیدیوں کو اسٹیشن پر آٹھ آٹھ گھنٹے رکھڑاتے رکھنے والے اُس پاپی کمانڈر کی کتنے مزے سے ہنسی اُڑاتا ہے۔ اُس جیل سے دوبارہ ان قیدیوں کی مُنتقلی ہوئی۔ ووڈ ہاؤس کہتا ہے۔

''اُس قید خانے کو الوداع کہتے وقت میری آنکھوں میں آنسو وغیرہ نہیں آئے لیکن وارڈر نے ہماری وین کا

دروازہ بند کر کے پھر ''ملیں گے'' کہا وہ البتہ مجھے کچھ زیادتی والا ہی لگا۔''

''ہاؤ ٹو'' سے شروع ہونے والی امریکی بہت ساری کتابیں ہیں۔''ہاؤ ٹو وِن فرینڈس''۔۔۔ ''ہاؤ ٹو بی اے مِل اونر''۔۔ایسی جھٹ پٹ خوشی دینے والی کتابیں۔ووڈ ہاؤس نے اپنی تقریروں کو''مکمل علم نہ ہوتے ہوئے بھی فری وقت میں کس طرح مقیّد ہوا جائے ؟''ایسا نام رکھا ہے۔اُس قید خانے کے بعد ان چوالیس قیدیوں کا ریل کا سفر بالکل مویشیوں والے ڈبّے میں ہوا۔اُس بھیڑ کی دھکم دھکّا والی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے ووڈ ہاؤس کہتا ہے۔''کم عمر میں بیڑی وغیرہ پینے کی عادت پڑ جانے کی وجہ سے بڑھنا رُک گیا ہوا ایسے گھوڑے کے بچّوں جیسے بمشکل تمام آٹھ گھوڑے سماسکیں ایسی جگہ میں چالیس لوگ ٹھوس دیۓ جائیں تو وہ چڑ ہی جائیں گے۔۔ہم پچاس تھے۔رات میں ذرا پاؤں پسارنا چاہیں تو دوسرے مسافروں کو لات لگ جاتی۔اُسے بھی ایسا کچھ لگے تو ہمیں بھی وہیں جھیلنا پڑتا۔ڈبّے کی نچلی تختوں پر سوراخ تھے اُس میں سے برف جیسی ٹھنڈی ہوا ہماری ٹانگوں کو گھیرے رہتی۔اوپر کی چھت سے آنے والی ویسی ہی ہوا ہمارے سر کے پاس کھیلتی رہتی۔ہم سبھی چالیس اور پچاس سالوں سے زائد عمر کے تھے لیکن کسے بھی نمونیا نہیں ہوا۔گھٹنے نہیں پکڑے۔۔پیٹھ نہیں پکڑی۔کچھ بھی نہیں۔ مجھے لگتا ہے قید و بند والوں کی فکر کرنے والا اسپیشل پرمیشور ہوگا۔''

بالآخر یہ یاترہ بیلجیم کے لیج گاؤں میں آئی اور نازی فوجی نے ان لوگوں کو ایک پہاڑی قلعہ پر بھگاتے لے گئے اور وہاں کے بیرکس میں بند کر دیا........ '' وہاں کا ماحول تہوار شروع ہونے سے پہلے ہوتا ہے ویسا تھا۔پارٹی میں مہمان حضرات وقت سے پہلے پہنچ جانے پر جو ہلچل مچ جاتی ہے اُس طرح کا منظر تھا۔ بالخصوص کھانے کا۔شاید کسی بھلکڑ شاعر پر اس کی ذمہ داری سونپ دی گئی ہوگی اور قیدیوں کو کھانے کی ضرورت رہتی ہے وہ بھول گیا ہوگا۔

سچ مچ اُتھالی واٹیاں لگتی ہیں نہیں کیا ؟ کیوں جی ؟ سیدھے اُبلتے ہنڈے میں منہ ڈال کر سوپ پی جاؤ انھیں جمنے جیسا نہیں ہوگا۔نہیں کیا ؟ایسا بھی اس نے کہہ دیا ہوگا........ آخر کار دماغ چلا کر ہم نے وہ مسئلہ حل کر دیا۔

دماغ لڑا کر مسئلہ حل کر دیا یعنی کیا کیا ؟ اس بیریکس کے پچھواڑے پرانے ڈبوں کا، بوتلوں کا، کیتلیوں کا، اور موٹر تیل کے ڈبوں کا بیلجیم فوجیوں نے چھوڑا ہوا انبار لگا ہوا تھا۔ وہ کھنگال کر ان قیدیوں نے اپنے پیالوں کا انتظام کیا۔ ووڈ ہاؤس کے حصے میں موٹر تیل کا چھوٹا ڈبہ آیا تھا۔ اس وجہ سے میرے سوپ کو دوسروں کو نہ ملی ہوئی ایک لذت آئی تھی۔"

اُن بیریکس میں بے حد گندگی تھی۔ قیدیوں کو ہی صاف کرنا پڑی۔ وہاں کے سنڈاس تو ایک خاص بات تھی۔ اس کے علاوہ روزانہ تین تین بار یارڈ میں آٹھ سو قیدیوں کی گنتی کرنے کے لئے اُنھیں گھنٹے گھنٹے کھڑا کرتے۔ پانچ پانچ کی قطاریں بناتے۔ کبھی صحیح سے لگ نہ پاتیں۔ ہر بار مختلف گنتی نکل آتی۔ کار پول صاحب دوبارہ گننا شروع کر دیتے "بطور مجموعی ہمیں پانچ بار گن لیا جاتا......... قیدی سینڈی پول، اس گنتی پریڈ کے دوران ہم پانچ قطار میں ساتویں اور آٹھویں نمبر پر کھڑے تھے اس وقت بولا۔" جنگ کے خاتمے پر میرے پاس اگر بھرپور پیسے جمع ہوئے تو میں ایک جرمن فوجی خرید کر باغ میں کھڑا کرنے والا ہوں اور دن میں چھ بار اُسے گن کر نکالنے والا ہوں۔

مختصر یہ کہ گھنٹوں یہ آٹھ سو قیدی کھڑے ہیں اور کارپول، وارڈر اور سارجنٹ گنتے جا رہے ہیں ایک بار تو آٹھ لوگ کم گننے میں آئے۔ پھر ان کی دوڑ دھوپ شروع (جرمن سارجنٹ نے' اتنے میں کسی نے صف چھوڑ دی اس لئے اسے جرمن زبان میں گالی دی۔ فرینچ ذولسان نے ان گالیوں کا فرینچ میں ترجمہ کیا) آخر سبھوں کو دوبارہ بیریکس میں گھسا کر کھولی در کھولی گنتی کی اس کے باوجود آٹھ کم نکلے۔ سارے فوجی افسر فکر مند ہو گئے۔ آخر فرینچ ذولسان کو یاد آیا۔ اس نے کہا" صاحب، اسپتال میں داخل قیدیوں کا کیا؟......... افسران اسپتال کی طرف دوڑے۔ وہاں دراز ہوئے قیدیوں کی تعداد آٹھ ہو گئی۔ حساب کتاب بیٹھ گیا۔ ایک بار قیدی کہہ دیا کہ آدمی کا صرف "نمبر" بن جاتا ہے ووڈ ہاؤس ایک غیر معمولی ادیب تھا۔ کسی کے بارے میں دُشمنی کا تصور نہ رکھتے ہوئے، کسے بھی انسانوں سے اُٹھانے کی کوشش نہ کرتے ہوئے اپنے دلچسپ مزاح سے اس نے لاکھوں کو خوشی عطا کی تھی۔ لیکن قید ہو جانے کے بعد اس کا بھی" قیدی غمبر سات سو چھیانوے" ہو گیا۔

جرمن افسروں نے اسے لیج کے بیریکس میں سنڈاس صاف کرنے کا کام دیا۔ ریڈیو پر کی اُس کی تقریر میں اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے کسی کی ہمدردی حاصل کرنے کی کی کوشش نہیں کی۔ وہی مزاح کا اسلوب ''لیج کے بیریکس کی صفائی کرنے ہمیں بہت دن لگے۔ مجھے کسی کی بے عزّتی نہیں کرنی ہے۔ لیکن ایک بات کہتا ہوں۔ آپ نے جب تک بیلجیم فوجیوں نے استعمال کئے ہوئے سنڈاس صاف کرنے میں ہاتھ نہیں لگایا' اُس وقت تک میں کہوں گا کہ آپ نے کچھ بھی نہیں دیکھا ۔۔۔ چند سالوں بعد مجھے اگر کسی نے آکر پوچھا' کہ کیوں جی' جنگِ عظیم میں تم نے کیا کِیا !'' تو میں کہوں گا۔ ''لیج کے بیریکس میں سنڈاس صاف کئے''۔ اور مجھے سوال پوچھنے والا شخص فوراً مجھے لگا ہی تھا' ایسا کہے یہ ناممکن نہیں۔ کیوں کہ ہوا موافق ہو تب بھی میری جانب وہ خوشبو بکھیر دیتا ہے۔ کسی نے کہا ہے نا۔۔ آپ کانچ کا گلدان کتنی بار بھی توڑ ڈالیں پھر بھی اس سے جُڑی ہوئی گلاب کی خوشبو کیسے الگ ہوگی ؟

رہ رہ کر مجھے تعجب ہوتا ہے کہ ووڈ ہاؤس اس برلن براڈ کاسٹ میں جرمنوں کی مسلسل ٹوپی اُچھال رہا ہے یہ کس کے بھی ذہن میں کیوں نہیں آیا! اپنے پسندیدہ مصنف کو جبراً دشمن نے سنڈاس صاف کرنے لگائے یہ سُن کر چڑ آجانی چاہیئے تھی۔ لیکن ہوا بالکل مختلف۔ بی بی سی پر سے ولیم کانر نام کے مصنف نے تو ''ہٹلر کی توصیف کرنے کی منظوری پر ووڈ ہاؤس نے اپنی رہائی کروائی''۔ یہاں تک زہر اُگل دیا۔ اُس کی اُس تنقید میں ووڈ ہاؤس نے کیا کہا اس بارے میں ایک لفظ تک نہیں آیا۔ اس وجہ سے لوگوں نے سمجھا'' ووڈ ہاؤس نازی پرچار کی تقریریں کر رہا ہے'' یہی ہوا۔ بی بی سی کے گورننگ باڈی نے تک یہ غلط ہے اس لئے اس دروغ گوئی کو جگہ نہ دی جائے ایسا فیصلہ کیا۔ لیکن وزیر نشر و اشاعت نے ان پر سختی برت کر کانر کا ووڈ ہاؤس مخالف پرچار جاری رکھا۔

لیج سے ووڈ ہاؤس اور دیگر ہمیشہ کے سات سو نینانوے قیدیوں کی منتقلی وِیُونام کے ایک قلعہ پر کے کانسنٹریشن کیمپ میں ہوئی۔ جان لیوا ٹھنڈی۔ بستر لحاف نہیں۔

ووڈ ہاؤس کہتا ہے۔ '' داخل ہونے کے دروازے سے اندر جانے پر سیدھی جانب ایک خوبصورت بیت الخلاء تھا'' اِن قیدیوں کے کیمپ کے اہم منتظمین کو ایک ہی بات معلوم تھی۔ ''کوئی بھی قیدی کچھ بھی کرتا ہو تو اُسے وہ

کرنے سے منع کر دیا جائے''۔ پاؤ کا ٹکڑا' کافی ہوگا ایسا شبہ پیدا کرنے والا ایک مشروب' سوکھی سبزیوں کو اُبال کر تیار کیا ہوا سوپ۔ اس بھکمری کا بیان بھی ووڈ ہاؤس بڑے مزے سے کرتا ہے۔

''اس نامکمّل خوراک کو مکمّل خوراک کا نام دے کر ہم نے مختلف تجربے شروع کئے۔۔ میری دِیا سلائی کی تیلیوں کو چبانے سے عقیدت ہوگئی۔ اگلے دانتوں سے چبا چبا کر اس کا نوالہ بن گیا کہ اُسے نِگل دیتا۔ پیٹ بھرتا نہیں تھا لیکن بھوک کا سہارا کہنے بُرا نہ تھا۔۔۔ کبھی کبھار کینٹین کھُل جائے تو ہمیں آدھ انچ جوڑی' آدھ انچ لمبی اور پاؤ انچ موٹی ''چیز'' مِل جاتی۔ اس کے کھانے کا طریقہ اس طرح تھا۔ شکسپیئر کی شعری تخلیق یا ٹینیسن کی نظموں کا ایک اچھا سا صفحہ لیا جائے اُس میں اُسے لپیٹ دیا جائے۔ لذّت کے لئے دیا سلائی کی ڈبیہ کی چار تیلیاں اس میں ملائی جائیں۔۔۔۔ یہ پکوان کھانے میں لذیذ لگتا ہے۔

دِیئوقلع کے قیام کے دوران اُٹھائی جانے والی مصیبتوں کا احوال ووڈ ہاؤس اس طرح مزاحیہ انداز سے بیان کر رہا تھا۔ وہاں سے بھی پھر شمالی سائلیشیا کے ٹوسٹ نام کے گاؤں میں لیجا کر وہاں ایک عمارت میں بھر دیا۔ وہاں ڈھونگی پاگلوں کا اسپتال تھا۔ تین دن اور تین راتیں ایک جگہ بیٹھ کر ریل گاڑی کا سفر۔ اس دوران آدھا سا سیج، آدھا پاؤ اور تھوڑا سوپ یہ میزبانی۔ اس قید کے دوران ووڈ ہاؤس کا وزن چالیس پونڈ کم ہوگیا۔ احاطے میں تو سخت پہرا۔ سامنے اور پیچھے سنگین سنبھالے ہوئے نازی فوجی۔ اِن حالات میں اس پٹھے نے ایک مزاحیہ ناول لکھ ڈالا۔ یہاں ووڈ ہاؤس کا قیام بیالیس دن رہا۔ قیدیوں کے درمیان روزانہ ایک امید افزا افواہ گشت کرتی۔ وہ کبھی بھی سچ نہ نکلتی۔ ووڈ ہاؤس البتہ ''این ایپل اے ڈے کیپس دَ ڈاکٹر اَوے'' کی طرز پر کہتا۔

''اے رومر اے ڈے کیپس دَ ڈِپریشن اَوے''۔

روزانہ کی نئی افواہ من کی تھکان دور کر دیتی تھی۔ قیدیوں میں پروفیسر تھے' گلوکار موسیقار تھے' ماہر لسانیات تھے، مقرر تھے۔ کبھی کبھار ایک دوسروں کے ساتھ گھُل مِل جانے کے لمحے میسّر آتے تھے۔ نصیبوں میں آیا بھگتنا ہے کہہ کر سارے جی رہے تھے۔ اُن کی قوتِ ارادی مضبوط تھی۔ ووڈ ہاؤس کہتا ہے۔ ''اتنا خوش مزاج اجتماع اس سے پہلے مجھے کبھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ اُن کے ساتھ میرا بھائی جیسا پیار ہوگیا تھا۔'' زمانہ

قید میں حاصل کئے ہوئے سارے مصائب بھرے تجربات کا ذکر مزاح میں لپیٹ کر پہنچانے والے ووڈ ہاؤس کی ان تقریروں کا انجام لیکن دل دہلانے والا ہے۔ آخر تک اُس کا تصوّر یہ تھا کہ تقاریر پر امریکی کمپنی نے امریکہ کے سامعین کے لئے نشر کی ہیں۔ اس کا انگلینڈ میں اتنا متضاد ردِ عمل ہو رہا ہے یہ بات اس کے خوابوں میں تک نہ تھی قید کے زمانے میں ریڈیو کہاں سے سُنیں گے؟ اِن تقریروں کی وجہ سے اپنے امریکہ کے سیکڑوں قارئین کو میں زندہ ہوں اور مقیّد ہوتے بھی ساری مصیبتوں سے لڑ کر بچا ہوں یہ معلوم ہو یہی خواہش تھی۔ اس لئے برٹش شہری قیدی نمبر ۷۹۶ اس رول سے آخر میں وہ کہتا ہے ''میں مقیّد تھا اُس وقت جن امریکی رحمدل شہریوں نے مجھے خطوط بھیجے اُن کا میں تہہ دل سے شُکر گذار ہوں۔ اپنے خطوط کا ۔۔۔۔خصوصاً جس قسم کے خط مجھے مِلے ان خطوط کی ۔۔۔۔اہمیت کا قیدیوں کو ہونے والا احساس اُنھیں جو کبھی قید و بند سے گذرے ہی نہیں کیونکر ہو سکتا ہے''۔

جنگِ عظیم ختم ہوئی۔ ووڈ ہاؤس پر ہوئی ناانصافی پر برٹش پالیمنٹ میں گرماگرم بحث ہوئی۔ مکمّل تفتیش ہوئی۔ ووڈ ہاؤس بے گناہ تھا یہ مان لیا گیا۔ موت سے سال ڈیرھ سال قبل برٹش ملکہ نے اُسے ''سر پیلہم'' کا اعزاز عطا کیا۔ پر بوند سے گئی وہ حوض سے آتی نہیں ۔ اُسے ایک ہی اطمینان تھا۔ جس نسل نے زندگی میں کبھی ہڈی گوشت کا بٹلر یا لارڈ نہیں دیکھا تھا۔۔۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دور کا انگلینڈ نہیں دیکھا۔۔ وہ نئی نسل بھی ستّر سال پہلے کے اس کے قارئین کی طرح لاکھوں کی تعداد میں اس کی کتابیں پڑھ کر جی بھر کر ہنس رہی تھی ۔

۹۳ سال کا ووڈ ہاؤس، اس کی ۸۹ سال کی بیوی ایتھل۔ اس کے بارے میں ولیم ٹاؤن ایڈ کو لکھے ہوئے خط میں ووڈ ہاؤس کہتا ہے ۔

''خواتین کتنی ونڈرفُل ہوتی ہیں نہیں؟ ایتھل نے یہ سب کچھ کوئی شکایت کئے بغیر سہہ لیا۔ کتنا عظیم ، خوبصورت تھا اس کا رہن سہن ! گذشتہ تیس برسوں سے وہ اپنے پیار سے اور ناز برداری سے مجھے تحریک دلاتی رہی ہے۔ اس دوران نئی بلندی کو چھو لیا تھا اُس نے ''۔

۔۔۔۔۔شام کا وقت۔ بنگلے کے صحن میں وہ معمر جوڑا شیری پیتے بیٹھا تھا۔ ''نیو یارکر'' کا ایک مصنف

ہربرٹ وارن وِنڈمہمان بن کر آیا تھا۔ معمر اتھل اپنا شوہرٹی وی پر اُسے بالکل سمجھ میں نہ آنے والا امریکن فُٹ بال کا کھیل دیکھنے بیٹھ رہا ہوں کہہ کر مذاق کررہی تھی۔ زندگی امریکہ میں بتایا ہوا پلم یہ دل سے انگریز ہی رہ گیا۔ کرکٹ کی اُس کی سمجھ میں آنے والا کھیل ۔۔۔اور گولف، اُس کا تو وہ استاد تھا۔ لیکن امریکن فُٹ بال؟ کھیلتے کھیلتے کھلاڑی ایک ساتھ آکر گول دائرہ کیوں بناتے ہیں۔ پیٹ کر بال کس طرح بھگاتے ہیں۔ اس ووڈ ہاؤس کی بالکل سمجھ میں نہ آتا۔ پھر ووڈ ہاؤس کہنے لگا۔ ''اری مجھے امریکن فُٹ بال سمجھ میں آتا ہے ایسا نہیں ہے۔ پر لطف کیا ہے وہ تجھے معلوم ہے ؟

وہ کھلاڑی دوڑ دھوپ شروع کرتے ہیں۔۔اور درمیان میں ہی ایک ساتھ جمع ہو کر کھیل کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں ''۔

کچھ وقت خاموشی رہتی ہے۔ بنگلے سامنے کی ہریالی کی جانب اور کنارے پر کے لمبے درختوں کی قطاروں کی طرف دونوں بھی سکون سے دیکھتے ہیں۔ پھر ووڈ ہاؤس کہتا ہے۔'' کتنی خوبصورت لگتی ہے نا۔۔۔ ہریالی پر اُتری ہوئی یہ شام کی دھوپ'' ۔۔۔۔

زندگی کی شام کے وقت بھی اس کے دل میں ویسی ہی ہریالی تھی۔ ویسی ہی دھوپ تھی۔ زمانہ قید میں اُٹھائی ہوئی تکلیفیں اوراس میں بھی اس کے پیارے انگلینڈ نے اس کی کوئی خطا نہ ہوتے ہوئے بھی نچلی سطح کی کی گئی کردار کُشی، اس ضمیر کی ہریالی کا سبز رنگ اور روشنی' مٹا نہ سکی۔ جرمنی نے اتنی حالت بنانے کے باوجود ' پلم' تجھے جرمن لوگوں سے چڑ نہیں آتی کیا ؟'' اس سوال کا جواب دیتے ہوئے پلم نے کہا تھا۔''جوانو، میں اس طرح تھوک نفرت نہیں کرتا''۔

اُس روز ریل گاڑی میں میں نے ووڈ ہاؤس کی کتاب کھولی ، پہلے ہی باب میں ہنسی پھوٹ نکلی، لیکن ہنستے ہنستے آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے وہ صرف ہنسنے کی وجہ سے آئے ایسا نہیں لگا ۔

☆ ☆ ☆

(میتر)

راؤ صاحب

''دِلے دان گھٹیلے دان پُوچھا جنمی مسلمان'' (دان دیا دان لیا اگلے جنم میں مسلمان) ایسا ایک ہمارے بچپن کا چھیڑ چھاڑ کا فقرہ تھا۔ دیا ہوا دان واپس لینے والے کو مسلمان ہی ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ دان بانٹنے کا کام کوئی مذہب کے لحاظ سے تقسیم نہیں ہوا ہے۔لیکن ''دان'' کے ساتھ مسلمان کے ''اعزاز'' کا قافیہ ملتا ہے، بس صرف اتنا ہی اس کا مطلب تھا۔لیکن دیا ہوا دان کسی بات کا خیال نہ کرتے ہوئے واپس لینے والا ایشور جیسا قوی داتا اور لیتا دوسرا اور کوئی بھی نہیں ہوگا۔

کسی ایک شخص کی اور اپنی ویولینتھ کیوں مل جائے اور کسی دوسرے کی کیوں نہ مل پائے اس کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ پندرہ پندرہ بیس بیس سالوں کے شناسا افراد ہوتے ہیں لیکن سوائے تھوڑی دیر کے لئے غیر رسمی ملاقات سے آگے تعلقات نہیں بڑھتے۔اُن کے گھر آنا جانا ہوتا ہے۔ ملنا بولنا ہوتا ہے۔لیکن ملاقات ہونے کے باوجود دِل نہیں جُڑتے۔اور کچھ لوگ لمحے بھر میں جنم جنم کا رشتہ ہوا ایسا طوق ڈال کر چلے جاتے ہیں برتاؤ میں رچی بسی سنجیدگی لمحے بھر میں ختم ہو جاتی ہے۔ وہاں جگہ کا انوکھا پن آڑے نہیں آتا۔ وراثت میں ملی تربیت، زبان، لذّت، پسند ناپسندگی......... کسی کے بھی سہارے کی ضرورت نہیں پڑتی، دھاگے جڑ جاتے ہیں، گانٹھیں بیٹھ جاتی ہیں۔

بیلگاؤں کے کرشن ہری ہر سے ایسے ہی ملاقات ہوئی۔اُنھیں ہر کوئی ''راؤ صاحب'' کہا کرتا تھا۔ یہ راؤ صاحبی اُنھیں سرکار سے عطا نہیں ہوئی تھی۔ پیدائش کے وقت ہی سے اپنے ساتھ لے آئے تھے اور آخر دم تک چھوٹ نہیں پائی۔ مناسب لمبائی، سفید پتلے بال پیچھے پھرائے ہوئے، قسمت تصویریں کھینچنے کے لئے

بنائی جاتی ہیں ویسی پیشانی، دھوبی کی تہہ کی ہوئی دوٹانگی لیکن پلّو نکالنے جیسی دھوتی پہنتے، اوپر ریشمی شرٹ، اولن کوٹ، ایک ہاتھ کی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی، اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں چھوٹی انگلی اور بازو کی انگلی کے درمیان سگریٹ پکڑی ہوئی، اس کا چلم کی طرح کش لینے کا انداز، ضلع کلکٹر سے راستے کا بھکاری تک ہر کسی کو، ہر تین لفظوں میں ایک گالی کا لفظ استعمال کئے بنا اس شخص کا ایک جملہ پورا نہ ہوتا۔ مراٹھی کو ٹھوس کنڑی لب ولہجہ کنڑی کو اصل مراٹھی ساز۔ معمولی سرگوشی فرلانگ بھر دور سنائی دے اتنی نازک آواز! کسی بھی جملے کی ابتداء ''بھ'' کی آواز سے بننے والی گالیوں کے سوا نہ ہوتی۔ مراٹھی پر کنڑی کے اثرات کی وجہ سے تذکیر و تانیث ہی نہیں اِسم ضمیر، فعل، فاعل، مفعول، کی اتنی شکست وریخت کرتے کہ داداو بابا پانڈورنگ یاد آ ملے۔ جملے سب صرف ونحو والے چکرا کر گر ہی جاتے۔ صاف کیسے بولا جائے اور صاف کیسے لکھا جائے یہ قواعد پڑھ کر سمجھ سکے تو سمجھ لیا جائے لیکن دُنیا کی نظر سے ساری آلودگی کرنے والا یہ شخص میرے لکھنے کے قلم کی روشنائی جیسا پاک تھا۔ غصّے پر قابو پانا یہ خوش اخلاقی کی نشانی ہے ایسا سمجھ لیا جاتا ہے۔ راؤ صاحب سے اتنا ہو نہیں سکتا تھا۔ اس کے باوجود راؤ صاحب خلیق تھے۔ کچھ لوگوں کے رہن سہن و برتاؤ کا طریقہ ایسا ہوتا ہے کہ اُن کے ہاتھوں سے شہد کا چھتہ بھی کھل جاتا ہے اور کچھ لوگ دودھ تک تاڑی پینے جیسا پی جاتے ہیں۔ راؤ صاحب شوقین تھے لیکن شان وشوکت والے نہ تھے۔ زندگی میں اُنھوں نے بدنصیبی کے کئی روپ دیکھے تھے۔ پر بھوکا شیر کیا اپنی چال ادھ مرے کتے جیسا چلے گا؟ سونے کی تھالی میں پہلا نوالا کھانے والا دھتّر بچّر اوہری ہرنے وکالت کی گندگی کے اثر سے آنے والی اگلی زندگی میں کبھی کبھار باسی روٹی کے ٹکڑے بھی توڑے تھے۔ البتہ کچھ ہاتھوں کا لمس ایسا ہوتا ہے کہ اُن ہاتھوں میں کنہیر کے پھول بھی گلاب جیسے معلوم ہوتے ہیں۔ راؤ صاحب کی تربیت خاندانی صحیح پر یہ انسانی بھیڑ میں رہنے والا۔ بیرونی کانس سے بنا ہوا معلوم ہوتا۔ رنگ ویسا ہی تانبوس کالا تھا۔ سگریٹ پیتے ہوئے اس کا چہرہ لال اور کالے کے ملے جلے رنگ جیسا ہو جاتا۔ پھر دس میں پانچ بار اسے زوردار ٹھکا لگ جاتا۔ کیوں کہ وہ ہنسی بھی ناف کے ڈنٹھل سے پھوٹ نکلتی تھی۔ مسکراہٹ وغیرہ ہنسی کی نازک اقسام اس کے چہرے پر راس نہ آتے۔ ایک دم سات سے اوپر کی منزل۔

اس راجا آدمی کی اور میری پہلی ملاقات کولہاپور کے شالینی اسٹوڈیو میں ہوئی۔ دس پندرہ سازوں

پر مشتمل سامان میں سامنے جما کر گانا بٹھا رہا تھا۔ ریکارڈنگ سے پہلے کی صفائی (تیاری) چل رہی تھی۔ وشنو پنت جوگ اپنی پہاڑی آواز میں گا رہے تھے۔ لئے کچھ گائیکی طرز کی تھی۔ جوگ کا اوپری سُر ٹھیک بیٹھ گیا تھا اور سازوں کے میل اور سُر کے درمیان کوئی اونچی آواز میں چلاّیا۔

''ہا.....ن.....تیرے آ.....!''

اِتنی ٹھوس داد کس نے دی اس لئے گھبرا کر میں نے مُڑ کر دیکھا۔ بال گجبر راؤ صاحب کو لیکر آگے بڑھے اور مجھ سے کہا'' یہ بیلگاؤں کے کرشن راؤ ہری ہر ٹھیک ہے۔ ''

میں نے سلیقے سے نمسکار کیا اور راؤ صاحب نے جیسے ہمارا اور اُن کا اسکولی ساتھ ہو پیٹھ پر مکّا جما دیا۔

''کیا شاندار گاتا ہے ہاں............! '' راؤ صاحب کے منہ کے الفاظ جوں کا توں لکھنا بڑا مشکل ہے۔ جسم کی طرح دل کو بھی کُبڑا پن آیا ہوا ایسے لوگ پرلے درجے کا......... پرلے درجے کا ہے ایسا کہہ کر چلاّتے۔ (خوش طبع ماہرین چوکڑیاں بھرڈالیں)

'' واہ !.....لیکن اتنے میں وہ تمھارا طبل جی سہم سہم کر بجا رہا ہے تو.........اُسے ایک تھوڑا کا پاج کا .... طبلہ ایک تھوڑا سا چھپّر اڑانیوالا بجائے کہونا اُ.........سے۔'' یہاں پانچ لفظوں کی گالی چھپّر ا اُڑا لے گئی۔

ویسے ہی آگے بڑھے اور اس طبل جی کو اُنھوں نے پوچھا۔'' کس کارے تو؟ ''
طبلچی نے گھرانا بتایا اور مائک پر دھیمے بجانا پڑتا ہے وغیرہ وجوہات بتانے لگے۔

'' پھر ریکارڈنگ والے کو یہ مائک کا منہ اوپر اُٹھانے لگائیں آؤ تو۔ بلونت راؤ رکڈی کر کا طبلہ نہیں سنا کیوں رے؟ کس لئے کل کی بات، اُن کا ریکارڈ سن تو.........اُس کی آڑ تیرا یہ ....کا مائک کیوں نہیں آتا تھارے .... ؟'' کہتے ہوئے مائک وغیرہ اوپر اُٹھاتے ہوئے ''جمادے ہاتھ اب'' کہہ کر اس ریکارڈنگ پر قابض ہو گئے۔

اسٹوڈیو سے اُن کا پُرانا رابطہ تھا۔ ریکارڈسٹ بھی آشناؤں میں سے تھے۔ تھوڑی دیر اُن کا اور اِن کا اصل کولھا پوری میں بحث و مباحثہ ہوا۔

''مجھے کیا بتا رہا ہے ریکارڈنگ سے متعلق ؟'' پی۔ ایل ۔۔۔ اجی یہ تمھارے ریکارڈسٹ کھونٹے جتنے بڑے

تھے ۔۔۔میری دھوتی میں پیشاب کرتے تھے 'اب مونچھیں اونچی کیئے مجھے سکھا رہا ہے دیکھئے ۔۔۔اس کولھا پور کے کراؤن سنیما کا ناریل پھوڑا گیا وہ میری موجودگی میں رہے۔۔۔۔تو اُس وقت پیدا ہوا تھا کیا ۔۔۔ہاں، تیرے سازندوں کو لگا پھر بجانے ۔۔۔طاقت نہیں ایک کے xxx ! یہ ایسا ناٹک جیسا اور ساتھ کیسا رے ڈھیلا ڈھالا ؟ تھو ! یہ کیا طبلہ بجا رہا ہے یا خود کی ران کھجا رہا ہے ؟ ''اِتنا کہہ کر ٹھکا لگنے تک راؤ صاحب ہنس پڑے۔راؤ صاحب کا یہ بہروپ میرے لئے ناآشنا ہو بھی تو ہمارے اسٹوڈیو کے لوگوں کو تو معلوم ہوگا ہی۔کیوں کہ اُن کے اس روش سے ہٹ کر باتوں پر وہ دل کھول کر ہنس رہے تھے۔ ریکارڈسٹ اُنھیں اپنے بوتھ میں لے گیا اور راؤ صاحب اس کانچ کے عقب سے گردن ہلانے لگے۔اُس شخص نے اپنی پہلی ہی ملاقات میں مجھے اپنی جیب میں اُتار دیا۔

اس کے بعد سال دو سال کے اندر ہی میں بیلگاؤں میں پروفیسری کرنے گیا اور پہلے دن ہی راؤ صاحب کے اڈّے میں شامل ہو گیا۔راؤ صاحب سنیما تھیٹر کے کاروبار میں تھے۔بیلگاؤں کے رج تھیٹر کی بیٹھک کا اڈّہ راؤ صاحب کا دربار تھا۔اس دربار میں کئی نہ بولنے والے کردار جمع ہو جاتے۔اس آرکیسٹرا کے راؤ صاحب کنڈکٹر تھے ۔سیاست دانوں کو لیکن وہاں ممانعت تھی۔کسی نے ممانعت تو نہ کی تھی لیکن اُن کرسیوں میں اعزازی کرسی نہ ہونے کی وجہ سے وہ ذات اُدھر مُڑتی ہی نہ تھی۔رِج تھیٹر کے بازو میں ایک آفس کا چھوٹا سا بنگلہ تھا۔اُس کے دروازے پر شام کو کرسیاں لگا دی جاتیں۔پنکھا شروع کر دیا گیا ہوا ایسی شام کو چھ بجے کے قریب اُس گلی سے ہوا کا جھونکا شروع ہو جاتا۔ایک تو بیلگامی لونی جتنی ہی ہوا بھی خوشی دینے والی۔دھیرے دھیرے لوگ دن کے کاموں سے نپٹ کر وہاں جمع ہونا شروع ہوتے۔اُس بیٹھک میں عمر کی' علم کی' امیری کی' حاکمی کی ۔۔۔کوئی بھی پابندی نہ تھی۔کسی کھلاری کلکٹر کا تک ''آیا اس کی ماں کا لوگوں میں تیلیاں ڈال کر ۔۔۔'' ایسے ٹھیٹ الفاظ میں استقبال کرتے ۔راؤ صاحب کی گالیاں کھانے لوگ جمع ہو جاتے ۔پھر آہستہ سے وینکٹ راؤ مُدھولکر راؤ صاحب کی چھیڑ نکالتے۔وینکٹ راؤ مُدھولکر پیشے سے راؤ صاحب کے شریک۔لیکن بھائی بھائیوں نے کیا کیا ہوگا ایسا پیار۔دونوں کا جھگڑا سننے کی چیز ہوتا۔کسی اسکولی بچّے کی طرح وہ راؤ صاحب کو چھیڑتے ۔

''کیاراؤ صاحب۔۔۔آج پاؤڈر وغیرہ زیادہ لگائی ہے ۔۔''

بس۔اتنا ہی کافی ہوتا ۔

''ہاں۔۔۔بولئے کاڑی ماسٹر۔۔'' راؤ صاحب اُنھیں کاڑی ماسٹر کہا کرتے۔ان دونوں کی رفاقت یعنی ایک عجیب معاملہ تھا۔مُدھولکر خاندان سے ممتا شفقت رکھنے والے،تو راؤ صاحب کے شرفِ قبولیت حاصل ہوا ایسے سنسار کی بد قسمتی سے تہہ ہی بکھری ہوئی تھی۔مُدھولکر نے احتیاط برتتے ہوئے چھوٹے موٹے لوگوں کی بھلائی کی پرواہ نہ کریں تو راؤ صاحب بِنا سوچے دھوتی کھول کر دے دیں اور اوپر سے کہیں کہ''اپنے پاس پیسہ نہیں اس لئے لوگ کیا برہنہ گھومیں پھریں کیا !'' کہہ کر جھگڑا پیدا کرتے۔البتہ جوڑی جم گئی تھی لوگوں کے منہ پر ہری ہر۔ مُدھولکر ایسے جُڑواں نام تھے ۔

اُس اڈّے پر اسکول چھوٹنے کے بعد مِسکل نائیک ماسٹر آتے۔۔گانے کے کلاس کے بچّوں کو سا۔رے۔گا۔ ما،رٹنے لگا کر جی بھر کر ہنسنے اور ہنسانے وِجاپور ماسٹر آتے،ڈاکٹر کلکرنی۔ڈاکٹر ہمن سیٹھ جیسے کامیاب ڈاکٹر آتے۔۔کاگلکر بُوا حاضری دیتے۔پرشوتم والا ولکر جیسا ماہر ہارمونیم نواز''راؤ صاحب'سنگیت ناٹک جمایئے کہہ کر بھُن بھُن کرتا رہتا۔وشنو کیش کامت جیسا جگ یار چکّر کاٹ کر جاتا۔بیچ ہی میں رام کرشن پنت جوشی جیسے دولت کے دھنی ساہوکار آتے۔۔ بالا صاحب گُنڈی جیسے اِنتہائی ہر دلعزیز پولیس افسر آتے ۔۔۔موسیٰ بندھو آکر بے تکا کر کے چلے جاتے ۔۔۔رات کو نو نو بجے تک بلا ناغہ اڈّہ جم جاتا۔ البتہ سب میں زیادہ گڑ بڑ راؤ صاحب کی رہتی۔اُنکا جمی نام کا کُتا تھا۔اُس کی سمجھ میں بھی راؤ صاحب کی گالیاں آتی ہوں گی۔وہ بھی '' یو یو یو یو '' کہنے پر قریب نہ آکر ''جمیا، اِدھر آرے x x کی کہنے پر ہی قریب آتا تھا ۔

سنیما کے کاروبار میں راؤ صاحب کی زندگی بیتی۔مینیجری سے لیکر مالکی تک سنیما تھیٹر کے سارے مدارج سے وہ گذرے تھے لیکن پندرہ پندرہ ہفتوں تک چلنے والے پکچر کبھی اندر بیٹھ کے نہیں دیکھا۔ ناٹک اور موسیقی یہ اُنکے جی جان سے پیارے مضامین رموضوع ۔۔

کرناٹک کے ویشنو برہمنوں کے گھر یعنی بے حد دقیانوسی۔اُن سارے گھرانوں کی پاکی،ناپاکی کی تار

پر کسرت کرتے قدم بڑھانا تِس پر راؤ صاحب کے والد یعنی معروف وکیل ۔ واڑے کے اس چودہ چوکڑیوں والے راج میں باپ نامی راون کی مکمّل حکمرانی رہتی ۔ بچّے اسی لئے جنم پاتے ہیں کہ اُنھیں پیٹا جائے' ایسا ایک تصوّر تھا۔ نکمّے باپ تک ہاتھ میں سدا چھڑی اُٹھائے اپنے بیٹے کو اچھے برتاؤ کا سبق سکھانے آمادہ رہتا۔ یہاں تو کرتوتوں والا باپ ۔ گھر سونے کے سکّوں سے بھرا ہوا۔ ایسے اس پابند ماحول میں وشنو کے نام کے جپ اور گرم مزاج رشتہ داروں کے پوجا پاٹ کی آوازوں کے درمیان کرشن راؤ کے کانوں میں بیلگاؤں تھیٹر ناٹک سازوں کے سُر کیوں کر پڑے یہ میرے لئے تعجب کی بات ہے ۔ والد کی تیز نظروں سے بچ کر راؤ صاحب نے بھاسکر بُوا سے تُنگی رنگی تک سب کے گانے سُنے ۔ بال گندھروَ' باپوراؤ پینڈ ھارکر' دینا ناتھ کے ناٹک سیزن ٹکٹ کی کرسیاں پکڑ کر دیکھ لئے ۔ اسکول، پڑھائی وغیرہ معمولی چیزوں سے جی بھر کر نفرت کی۔ اصطلاح عام میں '' بچّہ بگڑ گیا '' ۔ شادی کا بندھن تک اُنھیں اس ماحول میں جکڑ کر رکھ نہ سکا۔ صاف ستھرے سماج کی ہتک چار زوردار گالیاں دے کر جھٹک ڈالی ۔ باپ دادا کی کمائی جائداد پر نظر نہ رکھ کر اپنی پسند کی ڈگر پر چل پڑے ۔ اکلوتے بیٹے کے نام کر کے اس دولت پر اُنھوں نے پانی پھیرا اور اپنی روٹی خود کمائی سے کھانے لگے ۔ فقیری اختیار کی اپنی خوشی کی فقیری عجب ہوتی ہے۔ اُس پر وہ پرانا دور ۔ کان پر ہاتھ رکھ کر گناہوں سے انکار کے کالم میں پوشیدہ انگنت باتوں کی فہرست ۔ فہرست کے اثبات کے کالم میں سب' نفی' درج! لیکن سُروں کی سنگت جمی ہوئی ۔ اپنے واڑے کے اچھے ماحول کی کھڑکیوں کی سلاخیں توڑ کر وہ باہر نکلے اور محفل کی دل رُبا کی سلاخوں سے رشتہ جوڑ لیا ۔ وہ دل رُبا لیکن کبھی ان کے قابو میں نہیں رہی ۔ محفل میں اُن کا رول محض خاموش سامع رتماشائی کا رہ گیا ۔ اُن سُروں کا بھوت جو اُن کی گردن پر قابض ہو گیا وہ آخر تک نہیں اُترا ۔ یہ نہ اُترنے والے بھوت ، ۔ نارائن راؤ بال گندھرو کے الاپ کی طرح اس قیمت پر والد کے ہاتھوں کی مار کرشن راؤ نے کیوں کھائی ، یہ بات وہی سمجھ سکتے ہیں جو اس شوق کے دیوانے ہیں ۔ لوگوں کے خیال سے گھر سنسار کو تیاگنے والے اس امیر کی فقیری ، صرف جمع خرچ کی بیاضیں پڑھنے والوں کی سمجھ میں نہیں آئیگی ۔ خود کے والدین کی یادوں سے نہ رونے والا یہ شخص '' موپے ڈار گیو '' کی یادوں سے کیسے اُداس ہو جاتا ۔ گانے کی دُنیا میں رہنے والے شخص کے یہ آنسو انسانیت کا انوکھا رنگ دکھا جاتے ہیں ۔ گلوکار ۔ گلوکارہ نے

لُٹائے ہوئے سُروں کے خزانے کی رسید اُن کی وفات کے بعد سوائے اشکوں اور کس سے لکھی جائے !جانے دو! کسی کی زندگی کو چوکٹ راس آتی ہے تو کسی کی زندگی رنگولی کے دانوں کی طرح بکھرنے کا مزہ لیتی ہے۔ رنگولی کا ہر دانہ جہاں گرے اپنا رنگ چھوڑ جاتا ہے، ویسے یہ لوگ جہاں جاتے ہیں اپنے ساتھ اپنا رنگ لئے جاتے ہیں۔ گھر کے چوراہے میں، مہذّب سماج کی چوکٹ میں اُن کے رنگوں سے مشابہ رنگ نہیں ملتا اُنھیں پھر اپنے سے ملتا رنگ ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ اِن لوگوں کا خاندان نرالا، خاندانی تربیت نرالی۔۔۔۔ ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں۔ چاہے جتنا اس سے بچنے کی کوشش کریں لیکن یہ چوکٹ نصیب سے جُڑی رہتی ہے اور زندگی کی لکیر بڑھتی ہی رہتی ہے۔

گھر کا کوئی بھی رواج نہ پالنے والے راؤ صاحب کو گانے بجانے کے رسوم نبھانے کی انتہائی خواہش، راگوں کے نام تک وہ پہچان نہ پاتے تھے لیکن چھٹے ہوئے سُر فوراً دھیان میں آتے اُن کے ''گلی بھول گیا کیا وہ پی ایل؟'' بھری محفل میں پوچھ بیٹھتے۔ ایک آدھ راگ کے کپڑے کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے یا راگنی کا پلّو سرک جانے کا احساس انھیں فوراً ہوجاتا۔ ''سوئمبر مان ایمان'' میں رنگنے والا یہ شخص '' وہ اندھے کی اسکول ناٹک کروجی۔ قومی ناٹک ہے اجی وہ۔ کیشوراؤ دانے اور جوتسنا بھولے کیا اداکاری کرتے تھے وہاں! تجارتی سطح پر وہ فیل ہوگیا لیکن لوگ xxx کا xxxx ! ''

اس انجان شخص کو کچھ الگ ہی جانکاری تھی۔ طبیلے کے گائے بیلوں کو منگل۔ اَمنگل کی ہوتی ہے اُس طرح۔ ایک بار بیلگاؤں میں کسی کمپنی کا ''مانا پمان'' ناٹک تھا۔ میں اور راؤ صاحب بازو بازو میں بیٹھے تھے۔ جوگلیکر ''دینا ناتھ'' پنڈھر پورکر بوا جیسے معتبر گلوکاروں نے گائے ہوئے بول اُن کے کانوں میں تھے۔ وہ گانے نئے اداکاروں نے گانا شروع کرتے ہی راؤ صاحب کی کھسر پُسر چار صفوں تک سُنائی دے ایسی شروع ہوگئی۔

''یہ کیا دھیر دھر کیوں جی ؟اِس پر اُس بھامنی کا کتا خوش ہوگیا کیا؟ ہرج کے بینڈ والے کی طرح نظر آتا ہے یہ ! ساڑیاں دھورے بھامنی کی۔۔''

میں لگاتار اُنھیں خاموش کئے جا رہا تھا۔ اُس روز اُس دھیر دھر کے پارٹیا (ساتھی) کو بھی نہ جانے کیا

اُلٹی سوجھی ایشور ہی جانے۔اُس نے ''یانول نینوتسوا '' کی لئے بدل کر وہ اڑتا گانا دھیمی لئے میں شروع کردیا ۔ یہاں راؤ صاحب آگ بگولا ہوگئے ۔اُس گانے والے اداکار کے جھوٹے دل لبھانے والے سُروں کے ہر موڑ پر راؤ صاحب کی جو گالیاں جاری تھیں وہ اگر اُس اداکار کے کانوں پر پڑتیں تو وہ ناٹک پیشہ چھوڑ کر گئور کھشن سنستھا کا صندوقچہ ہاتھ میں لئے پھرتے رہتا ۔

سین ختم ہوا ۔ (پردہ گرتا ہے)

''پی ایل۔۔۔چلیئے جی۔۔۔اُس دھیر دھر شندلی سے ملاقات ہو پاتی ہے کیا دیکھتے ہیں آؤ۔۔''

''جانے دیجئے راؤ صاحب ''۔۔۔میں نے حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے کہا ۔

''تم بھی روڑا اٹکانے میں نمبر ایک ۔۔۔ چلو جی۔۔۔''

ہم اسٹیج کی جانب گرین روم میں گئے ۔''وہ دھیر دھر کی پارٹی کچھ ادھر کہاں ہے جی؟'' کہتے ہوئے راؤ صاحب اندر داخل ہوئے اور اس تین چاند کے صاحبِ اعزاز سے پہلا سوال پوچھ لیا ۔

''تمھارے باپ نے بٹھائی تھی کیا اس نوتنسوا کی لئے؟ وہ پرانی لئے بدلنے کی کیا ضرورت تھی تمھیں؟'' دھیر دھر کی بولتی بند ہوگئی تھی اور وہ لکشمی دھر ہو گیا تھا ۔

''اجی وہ بھاسکر بُوا جیسا اور گووِند راؤ ٹیمبیا جیسے ماہر گلوکار لئے باندھ چکے تھے وہ کیا گانجہ پی کر لئے باندھتے تھے جی؟''

''لیکن ہم تبدیل نہیں کر سکتے کیا ؟ '' بیچارے نے مناسب ہمّت جُٹائی ۔

''بدل دو نا۔ دینا ناتھ منگیشکر نے نہیں بدلی تھی کیا ؟ ہمارے باپ کی ہمّت تھی کیا اُنھیں پوچھنے کی! لیکن وہ اُن کا حق بنتا تھا ۔اس کی ایک تان تم لو اور دیکھو کہ اصل میں کچھ خامی آتی ہے یا نہیں ۔چال بدلنی ہے تو اُس کے لئے مہارت کی ضرورت ہے ۔تمھارا گلا یعنی سُروں کا ایرنڈیل ہو جائے ایسا بے اثر ۔اور پھر چال کیوں بدلتے ہو کہہ رہا ہوں۔ کسی بال گندھروَ جیسے کے پاؤں پکڑ اور سارے گانے وغیرہ ٹھیک سے بٹھا تو۔ جمتا نہیں تو پھر خواہ مخواہ اونٹ کی دُم کے بِرے کو چوم رہا ہے میں نے کہا۔ کیا ضرورت تھی جی! گائیکی خاندان کے اصول پال تو۔ بلا ضرورت کراہنا کس لئے ؟ ''۔

راؤ صاحب کے لئے جتن کرنے جیسا خاندانی دھرم الگ ہی تھا۔ اس شوقین شخص کو اسٹیج پر رُکمنی ، سُبھدرا کا پلّو

سرک جانا بھی پسند نہ آتا ۔

''اجی'' یہ رُکمنی کیا بیلگاؤں کی بوگاروں کی بستی میں رہتی تھی کیا رے؟'' کہہ کر ناراضگی ظاہر کرتے ۔

''نارائن راؤ بیچ بائی نہ ہو تب بھی پلو مضبوط رکھا جائے اور یہ کیا ہے جی یہ ؟ تھو xxx ! ''۔

تھیٹر کہیں تو لڑکیوں کی ہمیشہ بھیڑ۔ ایسے وقت اس رسیا شخص کی آنکھوں کی پتلیوں کی جگہ صرف رعب رہتا کبھی کوئی غنڈہ یا کوئی موالی اس بھیڑ میں کسی لڑکی کو چھیڑنے کی شرارت کرتا نظر آئے تو پولیس کا انتظار کئے بنا اُس کو پیٹتے۔ تھیٹر کے نوکر چاکروں کی کیا مجال غیر فائدہ اُٹھانے کی! وہاں گالیوں کے ساتھ ہاتھ میں ہنٹر رہا کرتا تھا۔ شوق کرنا ہو تو وہ مناسب وقت و جگہ پر ضرور کئے جائیں اور کھلے عام کئے جائیں ایسی طبیعت کا یہ شخص ۔ سنسکرتی، اصول، سنجیدہ اور سنجیدگی جیسے الفاظ بھی اُن کی سمجھ میں نہ آتے ۔ ماں بہنوں جیسے لفظوں کا ڈھونگ بھی نہ رچاتے لیکن رہن سہن کا بُرا روپ فوراً اُن کے دھیان میں آتا ۔ کسی دوست کے گھر میں ہیں اس لئے جملے احتیاط سے استعمال کئے جائیں وغیرہ نفاست اُنھیں معلوم نہ تھی ۔ کسی ناٹک میں گندے فقرے آئے تھے اس لئے ہم سے کہہ رہے تھے ۔

''کیا کہوں بھابی ۔۔۔ کیسا تھا وہ ناٹک؟ ایسا گندہ لکھنے والے کے xxx ! بھو xxx کو اُلٹا ٹنگا کر xxx ! ''اپنی باتوں میں چند خطرناک لفظ آئے تھے اس کا ان کے دل کو احساس تک نہ ہوتا ۔

''اجی راؤ صاحب' خواتین کے سامنے بولنے میں تو ۔۔۔۔''

''ساری (Sorry) ہاں بھابی ۔۔۔ ہماری زبان یعنی اس کی xxx ۔۔۔ دیکھو'' ۔ یہ اُس پر طرّہ ! اور اس طرح راؤ صاحب کی طرزِ گفتگو کا اُن کے دوستوں کے گھروں میں تک کچھ انوکھا نہ لگتا ۔ چھوٹے بچّے کے شرٹ اوپر اُٹھا کر گھومتے پھرتے رہنے میں کوئی غیر مہذب طریقہ نہیں لگتا ایسا ہی اُن کا اسلوب تھا ۔ چار گالیوں کا تیکھا پن شامل کئے بنا اپنے جملوں کا صحیح مطلب نہیں نکل سکتا کہیں ایسا تو وہ سمجھ نہیں بیٹھے تھے' بھگوان جانے! لیکن اُن کا غصّہ اور پیار دونوں بھی تیکھے رہتے ۔ اُن کی خوراک تو بے حد تیکھی ۔ ہری مرچ کچّی ککڑیوں کی طرح کھاتے ۔ اُس سے پیدا ہونے والی متوقع تکلیف آخر کار پیدا ہو ہی گئی ۔ ڈاکٹروں نے سخت پرہیز پر رکھا ۔ مہینے بھر میں اس شیر کی بکری بن گئی تھی ۔ ایک دن وہ پریشان ہو گئے اور کوٹی ہوئی مرچ کا

اچھا خاصہ گولہ کھالیا۔ اُٹھا کر اسپتال میں لیجانا پڑا ۔

اس شخص میں بے حد خودداری تھی ۔ دل کی بات دل میں دبائے رکھنا یہ اُن کے لئے ممکن نہ تھا۔ بیلگاؤں میں آرٹ سرکل نام کا بقول راؤ صاحب' گانے بجانے کا کام کرنے والا' ایک ادارہ تھا لیکن ادارہ کے قوانین وضوابط کے مطابق ثقافتی پروگرام کرنے والا ادارہ ہے اس ادارے کی راؤ صاحب زندگی تھے۔ جی جان سے محنت کرکے اور اپنے ساتھیوں کے تعاون سے اُسے مقبول بنا دیا ہے ۔ ممبئی میں بھا. لے راؤ نے یا ناگپور میں نانا جوشی نے اس کام کے لئے جان قربان کردی ویسے ہی بیلگاؤں میں راؤ صاحب نے ۔ آرٹ سرکل یہ اُن کا مقصد تھا' اُن کی دیوانگی تھی ۔ اچھے اچھے گلوکار سنگیت کاروں کی محفلیں منعقد کرتے ۔ شائقین کو اکٹھا کرکے ناٹک کرتے اور سال میں ایک بار نئے گانے بجانے والوں کے لئے مقابلے رکھے جاتے' ایسے کام وہاں بلاناغہ ہوتے رہتے ہیں ۔ اس کشمکش کے دوران راؤ صاحب کومہینہ مہینہ بھر فرصت نہ رہتی ۔ سارے بیلگاؤں کے شوقین سماج کے لئے یہ کشمکش یہ مقابلہ ولولہ انگیز واقعہ بن جاتا ۔ راؤ صاحب تو اس طرح پیش آتے مانو یہ اُن کے گھر کا ہی کام ہے ۔ منہ سے لفظوں کی تہیں نکلتی ہوئیں سارے کارکنوں کو تیز دھار پر رکھا ہوا خود کے پیسے خرچ کرکے آنے جانے والوں کی مہمان نوازی کرتے ۔ کسے ڈھال ملیگی' کون نمبر حاصل کرے گا اس موضوع پر اسکول کے طلبہ کے اِس جوش وخروش سے شام کے اڈّے پر بحث وتکرار رہتی ۔ گھر میں بیچاری کاشی تائی راؤ صاحب کے اس سرگوشی بھری بیداری اور بے وقت کے مہمانوں کی خاطر تواضع سے تھکی ہوئی گھر کی چاردیواری کے بیچ رہ کر ''میں'' اور ''میرا'' کہنے والی یہ جان نہیں تھی ۔ امارت کی ہوائیں بڑی تعداد میں جسم سے گذر جائیں تو بہت سارے لوگوں کے دلوں میں لقوہ بھر جاتا ہے اکثر اوقات لوگ شکست سے زیادہ کامیابی سے بھی گھبرا جاتے ہیں ۔ راؤ صاحب کے من کے فولاد پر مختلف قسم کا پانی چڑھا ہوا تھا ۔ اُس پر زنگ نہیں لگ سکتا تھا ۔ اُن کی میری اتنے سالوں کی پہچان میں کبھی میں نے سُستی سے پڑا ہوا نہیں پایا ۔ کچھ بھی کرنا ہو تو '' آؤ ابھی کرلیتے ہیں '' فلاں فلاں کی گیتوں کا پروگرام طئے پایا کہ '' کارڈ لو ۔۔ ابھی لکھ ڈالو ۔ پھر وہ کہیں اور چلا گیا تو پریشانی نہ ہو ۔۔ '' صبر دھیرے دھیرے کریں گے'' ایسی زبان ہی نہ تھی اُن کی ۔ خیال اور عمل ان میں کسی قسم کی مشکل نہ تھی ۔ اُس آرٹ سرکل کا میں نے ایک ناٹک بٹھایا تھا ۔ کام کرنے کے

لئے گاؤں کے سبھی شائقین تھے۔ راؤ صاحب کے رِج تھیٹر میں ناٹک رکھا گیا تھا۔ صبح نو بجے ناٹک کا وقت۔ میں، میری بیوی اور ایک دو اداکار ایسے پیشگی تیاری کی خاطر صبح پانچ ساڑھے پانچ بجے تھیٹر گئے۔ دیکھا تو راؤ صاحب ہاتھ میں جھاڑو لئے اسٹیج کی صفائی کر رہے ہیں اور نوکر لوگ چوروں کی طرح کھڑے ہیں! میں نے کہا۔

''اجی، یہ کیا ہے راؤ صاحب؟''۔

''تم منہ کو رنگ لگانے کا دیکھ لو''۔

''اجی، لیکن آپ کیوں جھاڑو لگا رہے ہیں؟''

''پھر کیا اِن x x x سے کہوں؟ ارے، آج ناٹک یعنی بھابی کام کریں گی۔۔۔ ہمارے سنس صاحب کی صاحبزادی۔ ہوا۔ اچھے گھر کی لڑکیاں کام کریں گی۔ اُن کے پاؤں میں اسٹیج کی میخ وغیرہ لگ جائے تو! اِن حرامزادوں کو کیا پرواہ ہے اُن کی؟ جھاڑنے کہا تو صرف جھاڑو پھیرا دیں گے اور پانچ اوپر کئے صرف بیڑیاں پھونکتے بیٹھ جائیں گے خاموشی سے۔ اِن کے باپ نے کبھی صاف کیا تھا اسٹیج۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے دیکھا تو تین میخیں اِدھر x x x! تم چلو بھابی ۔۔۔ تو x x کا میک اپ والا آیا نہیں ابھی تک۔''

جملے کے ایک ایک جھٹکے کے ساتھ سونے کی جھاری میں دودھ پیا ہوا مالک تھیٹر میں جھاڑو دے رہا تھا ۔۔

ہماری بال بچیاں وہاں چلیں گی۔ پاؤں میں کیلیں جائیں گی اس لئے ۔۔۔

ناٹک شروع ہو گیا۔ شوقین لوگوں کا کیا ہوا یہ ناٹک جتنا اچھی طرح ہونا چاہیئے تھا ہو گیا۔ سر سے پانی کا بھرا کلس اُنڈیل دیا جائے ویسے راؤ صاحب کے چہرے سے تعجب و خوشی ٹپک رہی تھی۔ دو چار مہینوں کی تعلیم کی محنت۔ آخر شائقین ہی ٹھہرے وہ لہٰذا اُن میں سے چند کا روٹھنا سب کچھ تھا۔ ناٹک پورا ہونے کے بعد دوپہر میں گھر میں آ کر سو گیا تھا۔ نیند میں ایسا لگا جیسے کوئی پیٹھ پر سے ہاتھ پھیر رہا ہے۔ میری آنکھ کھُل گئی۔

''خوب محنت کی تھی آپ نے''۔ راؤ صاحب میرے کاٹ پر بیٹھے تھے۔

راؤ صاحب میرے کچھ بھی نہ تھے۔ گائیکی کی یا ناٹک کی اُنھیں بہت معلومات تھی ایسا بھی کچھ نہ تھا۔ ادب وغیرہ کے مسائل سے اُن کا تعلق ہی نہ تھا۔ میں کالج میں 'مراٹھی پڑھاتا ہوں' یعنی کیا پڑھانا ہوتا ہے اُس میں

صاحب ؟'' ایسا اُن کا سوال رہتا۔ کتاب تو در کنار لیکن روز نامہ تک پڑھنے کی اُنھوں نے زحمت گوارہ نہیں کی۔ سیاست اور اس سے متعلقہ لوگوں سے اُنھیں بے حد نفرت تھی ۔ کسی بھی پروگرام کے لئے کسی لیڈر کو مدعو کرنے کی بات آجائے تو راؤ صاحب پہلے مخالفت کرتے۔ ہمارے اڈّے پر کسی نے سیاست چھیڑی کہ راؤ صاحب ''ڈال رے اس x x x کو لیجا کر بارہ گڑھوں کے کنویں میں''۔ غصّے میں آکر کہتے۔'' یہ حب جا کیٹ نہرو ہاں x x کے ! ''۔

بیلگاؤں یعنی کنٹری۔ مراٹھی تنازعے کی سُلگتی بھٹی ۔ایک بار رائے شماری ہوئی۔ راؤ صاحب نے اپنی مادری زبان مراٹھی لکھنے پر کسی نے اُنھیں چھیڑا ۔

'' یہاں پر مراٹھی ناٹک کے لئے بھیڑ رہتی ہے یا کنٹری کے لئے رے x x x کے۔ دکاندار کا بورڈ جس زبان میں لکھا جاتا ہے وہ اُس گاؤں کی زبان ۔۔ کچھ تو گانے والے کے بارے میں کہو جی، کنٹری اور مراٹھی دونوں بھی لیکر ڈال دیجئے وہاں''۔ وہاں یعنی کہاں یہ اڈّے کے سبھی لوگوں کو معلوم تھا ۔

گلوکاروں اور موسیقاروں پر بے حد پیار تھا اُن کا۔ کئی بار اُن کی مالی مشکلات دور کیں۔ کسی معمولی ہارمونیم نواز یا طبلہ نواز کو ساتھ لیکر جاتے ہوئے ایسا چلتے مانو کسی اعلیٰ سرکاری عہدیدار کو ساتھ لئے جارہے ہیں۔ ایک بار سرکل میں ولایت خان کے ستار بجانے کا پروگرام تھا، رِج میں مہمانوں کو ٹھہرانے کے لئے ایک خوبصورت کمرہ تھا۔ وہاں خان صاحب کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔

کھڑے ہو جاتے ہیں ۔موسیقی کے سننے کی تعلیم کے دوران میں نے توڑی متعدد بار سنی ہے لیکن دو توڑیاں میرے دل میں گھر کر گئی ہیں۔ ایک پونے میں کیشو راؤ بھولے کے گھر میں ملکّارجن نے گایا تھا، وہ اور دوسرا بیلگاؤں کے اس آرٹ سرکل میں ولایت خان صاحب نے رات ڈھلنے کے وقت بجایا تھا وہ۔ خان صاحب نے توڑی کے سروں کی لہریں نکالی تھیں۔ اُن کی انگلیوں کی بجلی سرایت کر گئی تھی۔ جلسے کی جگہ سے ہم رج کے اس گیسٹ روم میں آئے ۔ خان صاحب بستر پر دراز ہو گئے تو راؤ صاحب کے ان کے پاؤں دبانا شروع کردے! وہ اُن کے جسم کو رگڑنے لگے۔ خان صاحب شرمندہ ہوئے۔ راؤ صاحب اپنی اعلیٰ اردو میں ان کی تعریف کر گئے۔ بوقت ضرورت سختی سے پیش آنے والے راؤ صاحب کو گھائل ہوا پایا کہ اس برانڈ کے پُتلے

کے دل میں کھلکھلاتا ہوا نرم پانی نظر آتا۔ راؤ صاحب تہذیب سے دور تھے وہ کتنا اچھا تھا! ہم سبھوں کو اُس دن خان صاحب کے پاؤں پکڑ لیں ایسا لگتا تھا۔ راؤ صاحب نے پکڑ لئے۔ سنجیدہ تہذیب، سماج میں اپنی مقبولیت و جگہ، تمدّن ۔۔۔ کوئی بھی کواڑ راہ میں نہیں آیا۔ دل کے کواڑ کھول کر چلنے والے یہ لوگ۔ اندر سیدھے سیدھے جھانک لیا جائے اس لئے ان کے برتاؤ میں سختی نہ تھی۔ دھیمی آواز میں بولنے کی نفاست نہ تھی اچھوں کے لنگوٹی یار اور بُروں کا لکڑی لیکر پیچھا کرنے والی ایسی یہ ایک عجیب چیز تھی ۔

آرٹ سرکل کے لئے جی جان نچھاور کرنے والا یہ شخص اعزاز پانے کے وقت غائب ہو جاتا۔ اسٹیج پر بیٹھنے کا موقع آ جائے کسی بھی مشکل میں نہ لڑکھڑانے والے راؤ صاحب کی زبان میں رعشہ پیدا ہوتا۔ سیدھے گاڑی میں بیٹھ کر بھاگ جاتے۔ زندگی میں اُن پر ہار ڈالے گئے وہ صرف اُن کی میت پر ۔

بیر رکھا وہ بھی مردانگی سے۔ اُن کے ایک دوست کے ساتھ کسی کاروبار میں ساجھا تھا۔ کسی بنا پر اُن دونوں میں نفاق پیدا ہوا۔ ایک محفل کے وہ ساتھی۔ کٹھور برتاؤ کی وجہ سے اُس دوست کو اِن پر دعویٰ کرنا پڑا۔ بیلگاؤں کے کورٹ میں پہلی تاریخ پڑی۔ ہمیشہ راؤ صاحب کے یہاں قیام کرنے والا وہ دوست 'بیلگاؤں کے ڈاک بنگلے میں ٹھہرا۔ راؤ صاحب کو وہ بات معلوم ہوئی۔ وہ سیدھے وہاں پہنچے اور وہاں اُترنے کے لئے اُس پر گالیوں کی بوچھار کر دی ۔

''تمھارا اور میرا جھگڑا چکانے کے لئے وہ جج بٹھا تو دیا ہے سرکار نے عدالت میں۔ ہر ماہ x x ہزار ہزار روپے سرکار ڈال رہی ہے اُن کے ۔۔۔۔ اُدھر وکالت کے لئے کورٹ میں اپنا وکیل دیا ہے تم نے ہمارا بھی ہے x x کا! ۔۔۔ تمھارا وکیل دیوالہ نکال رہا ہے تمھارا۔ سچ کہیں تو ۔۔۔۔۔ اُسے چھوڑ ڈالئے لیکن تم یہاں کیوں اُترے شرم و حیا چھوڑ کر تم سے کہہ رہا ہوں ۔۔۔۔۔ x x x تم آؤ گے اس لئے وہسکی کی بوتل منگوائی ہے وشنو سے کہہ کر وہ کیا x x x x x x؟'' اگلے جملے لکھنا ممکن نہیں ہے۔ معمّر و معزّز شہریوں کو اُس کے پیچھے چھپی مضبوط انسانیت نظر نہیں آئیگی ۔۔۔ گالیاں ہی دکھائی دینگی ۔

دن بھر عدالت میں لڑنے والے یہ عجب مدّعی۔ مدّعی عالیہ شام کی محفل میں رنگ گئے تھے۔ اوپر سے اس دوست کو اس کا وکیل کس طرح دھوڈالنے والا ہے وہ اس کے پیالے میں وہسکی انڈیلتے بتا

رہے تھے۔ راؤ صاحب کے لئے نہ تو شراب ممنوع تھی اور نہ ہی لت لگی ہوئی تھی۔ اُن کی ضروری نشہ کی چیز ایک ہی۔۔۔''دوست ''۔

اور ایک بار''دوست'' کہہ دیا تو پھر اُسکے سُکھ دُکھ کی ساری ذمہ داری اِن کے سر پر۔ اُن کے رِج کے اُس خوبصورت کمرے میں بیٹھ کر میں اور رام گبا لے''دودھ بھات'' پکچر کے لئے کہانی تیار کر رہے تھے۔

''یہاں اطمینان سے بیٹھ کر لکھیئے، ڈسٹرب کرنے کوئی آیا تو اُس کی کمر پر لات مار کر باہر نکال دونگا''۔

''راؤ صاحب ۔۔لات وغیرہ کی ضرورت نہیں' صرف کہیئے ''۔

''اجی کہانی لکھنا کچھ ایزی (آسان) ہے کیا ؟۔۔بیچ میں ہی کوئی آئیگا۔۔۔خواہ مخواہ x x کا وقت برباد کریگا ۔۔لِنک ٹوٹ گیا تو سب کچھ گیا x x x میں۔۔۔''

ہمیں مطمئن چھوڑ کر راؤ صاحب گئے۔ دس پندرہ منٹ کے بعد پھر لوٹے ۔

''سٹوری شروع کردی کیا؟''

''نہیں ''

''ٹھہریئے۔ آج ایک لفظ بھی لکھنا نہیں ہے، آج شَیں کا وہ اماوس جو ہے۔۔نہیں نہیں !''۔

''جانے بھی دیجئے صاحب ''۔

''یہ نہیں چلیگا۔ اجی چلنا چاہیئے اپنا پکچر!'' اپنا پکچر! راؤ صاحب کا اس پکچر سے کوئی بھی تعلق نہیں تھا۔ لیکن اب وہ دوست کا کام یعنی گھر کا معاملہ تھا۔ دراصل راؤ صاحب دیودیو کرنے والوں میں سے نہیں تھے۔ میں نے کبھی بھی اُنھیں ماروتی، وشنو کرتے نہیں پایا۔ لیکن نیچے کسی کے ساتھ بات کرتے وقت کسی نے اُنھیں آج اماوس ہے کہہ دیا اور''کس لئے آج شروع کر رہے ہیں کہدیں'' بولتے ہی وہ دوڑے آئے ۔

اُس کمرے میں کوئی آکر ہمارے کام میں رُکاوٹ نہ ڈالے اس کا مکمّل بندوبست کرنے والے راؤ صاحب بذاتِ خود پچاس بار آکر چلے جاتے۔''ہاں ،آگے کیا ہوا ؟'' ایسا پوچھتے اور اپنی دُرستیاں سمجھاتے جوانوکھی رہتیں۔

''پی ایل' ایک بیسٹ سجیشن !''

''کہیئے''۔

''تمھاری وہ ہیروئین ۔۔کیانام ہے اُسکا ؟''۔

''اروندھتی ''

''ہاں ! وہ ارون دھتی رہتی ہے نا اُسے تھوڑ اِستارسٹ بنائیے۔خواتین نے سِتار بجانا چاہیئے جی''۔

یہ ایک راؤ صاحب کا کیسا پاگل پن تھا بھگوان جانے ۔اُن کی موٹر گاڑی کی پچھلی کانچ پر بھی ایک سِتار بجانے والی عورت کی تصویر اُنھوں نے چسپاں کردی تھی ۔

''راؤ صاحب لیڈی سِتارسٹ کیا کیجئے ؟ایک مندر کے بھٹ جی کی بیٹی وہ ۔۔۔۔وہ سِتارسٹ کیسے بن سکتی ہے ؟''

''پھر باپ بدل ڈالیئے نا اُسکا۔باپ کو تِھرکھوا کی طرح طبلہ پلیر بنائیے''۔

''مندر کا بھٹ جی کیا دیوتا کے سامنے پاک لباس پہن کر طبلہ بجانے بیٹھا ہے ایسا دکھانا ہے کیا ؟''

''دیو بدل ڈالیئے نا۔۔ایک تھوڑ اِستار اور ٹھان ٹھان طبلہ دیکھو ''۔

آگے اس کہانی میں وہ اداکارہ حاملہ رہتی ہے ایسا منظر رہتا ہے۔کہانی کا وہ حصہ سُن لیا ۔آدھ پونے گھنٹے کے بعد واپس لوٹے ۔

''تمھاری کون جی وہ ہیروئن ؟''۔

''اروندھتی ''۔

اِس نام کے ساتھ اُنھیں کیا بیر تھا کون جانے ۔آخر تک وہ اُن کے ذہن میں نہیں رہا ۔

''ہاں ا اُسے بچہ ہوا کیا ؟ ''۔

''ہوگیا ''۔

''کیا ہوا ؟لڑکا یا لڑکی ؟''۔

''لڑکا ''۔

''چلو اچھا ہوا۔لیکن یہ یاد رکھیئے جی۔۔خواتین آڈینس کے رونے کے لئے وہ بچہ ماروار مت ڈالنا۔''

اور دوبارہ آکر پوچھتے ''وہ ہیروئین کا بچہ کیسا ہے؟ مارو گے اس لئے کہہ رکھتا ہوں۔۔۔ بڑے آدمی مارڈالو، وہ بچہ کس لئے؟ بچہ مار کر لوگوں کو رُلا کر پیسے کمانا یعنی پاپ ہاں !تھو !وہ ہیروئین کے باپ' بھٹ جی رہتا ہے وہ۔۔۔ بوڑھا تو ہوگا وہ۔۔۔ مارڈالو اُسے۔۔۔ روئیں جو رونے دیجئے لوگوں کو ۔۔۔ بچہ مت ماریئے''۔

ہماری وہ کہانی لکھ کر پوری ہونے تک راؤ صاحب فکر مند تھے ۔اپنے کمرے میں پکچر کی کہانی لکھی جارہی ہے اُس کی دھن سوار تھی اُن پر ۔

''تمھاری یہاں سٹوری چل رہی ہے یہ کسے معلوم ہو کر فائدہ نہیں ۔۔۔ سکریٹ رہنا چاہئیے ''۔ کہنے والے راؤ صاحب نے ہمیں ڈسٹرب کرنے والوں کے پاؤں توڑنے کی دھمکی دیتے ہوئے راؤ صاحب نے وہ سکرِ پٹ نصف بیلگاؤں میں بتاچکے تھے۔ اُن دس دنوں میں اُنھیں چین نہیں تھا ۔ہم پانچ سات گھنٹے کہانی پر کام کر کے شام کو اڈّے میں آکر بیٹھ جاتے تھے ۔وہاں راؤ صاحب ۔۔''وہ تمھارے اُس اروندھتی کا ہسبینڈ رتھ کے نیچے مر گیا۔۔ بہت بُرا ہوا ہاں ۔۔۔ پاپ ۔۔۔'' کہکر ہماری سمجھ کرا رہے تھے۔ پری کتھا پڑھنے والی لڑکی کو جس طرح ہوتا ہے اور اس طرح سچ مچ کا کوا ابھی چیٹکی کی بدّ عا سے کوا بنا ہوا راج پُتر (شہزادہ) ہی ہے ایسا لگنے لگتا ہے، ویسا اُن کا حال ہو چکا تھا ۔

اُس پکچر کے میں گیت لکھ رہا تھا ۔راؤ صاحب ہر پانچ منٹ کے بعد ہو گیا کیا گیت ؟ کہتے ہوئے آتے۔ میں بیچارہ ''دیوا '' کے لئے ''سیوا ''اور ''پریتی'' کے لئے ''بھیتی ''جمانے کی فکر میں تھا۔ راؤ صاحب آکر کب کھڑے ہو گئے پتہ ہی نہ چلا۔

''اس کی ماں کا ایک اتنا سا گیت لکھنے کے لئے کتنا وقت ہاں ؟''

''راؤ صاحب' اِن میں بڑی مشکلات رہتی ہیں۔ یہ دیکھئے اب ۔۔۔ 'اُرتی پراچی' پراچی کا ہم قافیہ ڈھونڈنا ہے ''۔

پھر میں نے اُنھیں قافیہ کے مسائل سمجھا کر بتائے۔

''یعنی اب پراچی کا جوڑ ڈھونڈ نکالنا تکلیف کی بات ہے نا؟ ''۔

راؤ صاحب چلے گئے میرے ایک دو شعر لکھ کر ہو گئے۔ دوپہر میں راؤ صاحب پسینے میں شرابور کمرے میں

حاضر۔

''پی ایل ۔۔ایک تھوڑا '' گچّی ''جمتا ہے کیا دیکھو ''۔

'' گچّی ؟''

''اجی وہ ۔۔پراچی کے لئے ۔۔۔وہ کیامُوا کہہ رہی تھی وہ ۔۔۔ڈھونڈ نہیں رہے تھے تم !' گچّی 'میں چی نہیں آتا ہے کیا آخر میں؟''

راؤ صاحب قافیہ کے بندھن سے اپنے دوست کو چھڑانے آئے تھے۔ہمارے اس گیت میں ' گچّی 'بیٹھ نہیں پاتا کہنے پر اُنھیں بے حد دُکھ ہوا تھا۔کسی دن کوئی ایک آدھ ایسا بے تکا سوال کر بیٹھتے کہ اُن کے اس ڈراونے چہرے کی جگہ بچّے کی معصومیت جھلکتی۔

''پی ایل ۔۔ماں کا تم اتنے ایم اے ۔۔۔ہمارا ایک سمپل سوال بتاؤ نا ''۔

''کہیئے ''

'' آدمی ایسا کھدّر پہن کر لیڈر کیوں بن جاتا ہے جی! کہیں سِتار نہیں ' کہیں ناٹک واٹک دیکھنا نہیں ۔۔ خواہ مخواہ x x کے ہار گلے میں پہن کے گھومتا پھرے۔ایک شادی کہہ کر نہیں کرنی ہے یعنی نہیں !ایک اچھی سی عورت رکھنے کی وہ نہیں۔یہ اس طرح کیوں کرتے ہیں جی وہ؟''اور پھر وہ لیڈر ہوا میں کھڑا ہے اس طرح وہ کہنے لگے۔''ذرا دوست وغیرہ رکھ کے بیٹھ نکّمے ۔۔۔بیکار ہی وہ مائیکروفون کے سر میں زبان ٹِکائے بڑ بڑ بڑ کرتے ہیں سالے۔سوجا آرام سے اوپر پیچھے کا حصّہ اُٹھائے ۔۔کہیئے تو ''۔

''اب کیا کہیں سر ''۔

''چا x x x 'اجی ایم اے ہونا ہے تو کالج میں پڑھنا پڑتا ہے۔کتابیں پڑھیئے ۔۔امتحان دیجئے ۔۔۔ مصیبت ہی رہتی ہے جو۔۔۔کہیں گویا بننا ہے تو تنبورہ لیکر گلا پھاڑتے بیٹھنا پڑتا ہے۔۔لیڈر بننا ہے تو وہ کیا کرتے ہیں کہنے کو ؟ ''راؤ صاحب کے سوال کا جواب نہ مِل سکا مجھے ۔

اِس شخص کے میں نے طرح طرح کے ایسے روپ دیکھے۔ایک آدھ آدمی ہر طرح سے کیسا ہے وہ کون کہہ سکیگا!راؤ صاحب جس طرح مجھے نظر آئے ویسے سبھوں کو لگے ہوں گے ایسا اصرار میں بھی کیوں

کروں ؟ اُن کے ہاتھوں سے کچھ بھی مروڑا نہیں گیا ہوگا ایسا بھی نہیں ہے۔ خود بیلگاؤں میں بھی اُن کے بھی دوست تھے ایسے تھوڑے ہی ہے ۔

دائمی دشمن کے لئے چالاکی کی ضرورت ہے ۔ وہ تو اُن کے یہاں بالکل ہی نہیں تھی ۔ پر ایک بات یقینی تھی ۔ اس شخص میں کوئی کوتاہی نہ تھی ۔ اڑیل پن تھا' ضِد تھی ۔ بات منوانے کی خوبی بھی ہوگی ۔ جوانی میں بیلگاؤں میں رہائش ہوگی ناممکن نہ تھا۔ البتہ جو بھی خوبیاں خامیاں تھیں وہ اپنے اپنے وقت پر ضرور صاف دکھائی دی ہونگی ۔ چھپانے کا کام اُن سے ہو نہ سکا۔ ثواب ، عذاب کا نصاب بھی مختلف تھا۔ ایسے ہی ایک دفعہ ایک شب ہم تین چار دوست اُن کے رِج کے کمرے میں گاتے واتے بیٹھے تھے۔ راؤ صاحب موڈ میں نہ تھے ۔ اُن کا دھیان محفل میں نہیں تھا ۔ وجہ یہ تھی کہ خاص محفل جم جاتی تو وہ جسم کا کوٹ شرٹ اُتار کر بغیر بنیان پتلا ململ کا پیراہن زیب تن کئے بیٹھ جاتے ۔ اب تک کوٹ شرٹ جسم پر ہی تھا ۔ پرشوتم والا ولکر کے لئے '' شرنا گتا بجا بھی رے تھوڑی سی'' ۔ اس طرح فرمائش نہیں کی تھی ۔ کچھ دیر بعد نوکر کو آواز دی ''امیر '' امیر آیا۔ دوسرے کسی کو بھیج دے کہد یا۔ دوسرا نوکر تھر تھراتے آ کر حاضر ہوا۔ راؤ صاحب اُٹھے اور اُنھوں نے اُسے ایسی گالیاں دیں جو نہ ماضی میں دی گئی ہونگی اور نہ مستقبل میں دی جا سکتی ہیں ۔ اپنی مرضی کے مطابق بول کر ہو گیا پھر اپنی جیب کی پاکٹ سے پیسے نکالے ، اُس کے ہاتھ میں تھمادئے اور کہا ۔'' جا ' X ، کل صبح جمع کر دے یہ دفتر میں'' ۔ اُس شخص نے راؤ صاحب کے پاؤں پکڑ لئے ، اور اچھا خاصا درمیانی عمر کا وہ شخص چھوٹے بچّے کی طرح آواز نکال کر رو دیا اور درحقیقت آنسوؤں سے اُس نے راؤ صاحب کے پاؤں بھگو ڈالے۔

'' جا ۔ اب ۔۔ بیوی آئی اسپتال سے یا وہیں ہے اب تک؟''

'' لے آیا گھر۔ ''

'' کیوں ؟ داخل کر اُسے وہاں ۔ ڈاکٹر سے کہہ آیا ہوں میں ۔ ''

اس شخص نے اُنھیں کے دفتر کے پیسے کھائے تھے ۔ پولس میں جانے کی نوبت آئی تھی ۔

''غریبی ہاں غریبی ، انسان کو غلاظت کھانے پر مجبور کرتی ہے ۔ اٹھارہ سالوں سے ہمارے یہاں کام کر رہا ہے ، بیوی کی ہیلتھ بگڑ گئی ہے ۔ کچھ ٹی بی وی بی ہوگی ۔ سنیما کی نقد رقم آتی ہے ۔ کیسے دل کو قابو میں رکھا جائے ؟

ہاتھ بڑھ گیا۔ آٹھ بچّوں کا باپ۔ کیا اسے جیل میں رکھیں کیا ؟''

'' چوچ سچ کہیں تو سیدھے آپ کے پاس مانگ لیتا۔ '' کسی نے کہا۔

'' تم بھی عقلمند ٹھہرے دیکھے۔ میں کچھ تکلیف میں ہوں، دے تھوڑے سے پیسے، کہہ کر مانگنے پر کوئی دیتا ہے جی؟ میری بیوی سُکھ نہیں دیتی۔ ایک لڑکی دیتے ہو کیا اپنی ؟، پیشہ ور طوائف کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ گھر میں تھوڑا بہت سکھ ملے تو آدمی طوائف کے پاس کیوں جائیگا ہاں ! ''

ایسا سادہ سیدھا فلسفہ لے کر یہ شخص جیتا رہا۔ کسی نے اسے عقلمند کہا، کسی نے بیوقوف کہا، کسی نے اسے مہذّب کہا، کسی نے نشہ باز، کسی کی نظر میں وہ بُرے ہونگے۔ سبھوں کی گالیاں کو سنا سہتے اور ڈھٹائی سے لوٹاتے رہنے والا یہ شخص کہیں نہ کہیں رنجیدہ تھا۔ اکیلے رہیں تو اُن پر بے حد اُداسی چھا جاتی۔ اپنے جمی کو لئے تھیٹر کے قریب صحن میں کرسی ڈال کر اکیلے بیٹھے رہتے اور نواسوں، پوتوں کے ساتھ کھیلیں اُس طرح اُس کے ساتھ کھیلتے رہتے۔ اُن کے سچ مچ پوتے اور نواسے تھے لیکن وہ ہوتے بھی تو اُن کی گود میں نہ کھلیں ایسا کچھ اُلٹا پاسا پڑا ہوا تھا۔ پیاسے کو پانی نہ ملے یہ تو قانون کا پرانا کھیل ہے۔ راؤ صاحب کی سنسار کی بساط پر کچھ مہرے اُلٹے پڑے تھے، اُسے کوئی کیا کرسکتا ہے؟

لیکن یہ تنہائی اُنھیں راس نہ آتی۔ پھر رات گئے گاڑی نکال کر تلک واڑی ہمارے گھر آتے۔ آتے وقت اپنے ساتھ ہارمونیم نواز والا دلکر، ایک آدھا ابھرتا طبلہ نواز کو اُٹھالاتے۔

'' چلئے' ذرا گاتے بیٹھ جایئے نا۔ اس کی ماں کا پچھلے جنم میں ہم نے جانے کیا پاپ کیا تھا۔ ایک ساز بجانے آئے تو حرام۔ دیو کہیں تو وہ بھی کیسے حرام خور جی۔ جنھیں ضرورت نہیں اُن میں لیجا کر انڈیل دیا ہے۔'' اور پھر راؤ صاحب کے ساتھ رت جگا ہوتا۔

دن کیوں کر بیتتے یہ سمجھ میں نہیں آیا اور ایک دن بیلگاؤں کا ہمارا شئیر (حصّہ) ختم ہوا۔ کس کا جھوٹا کس گاؤں میں کتنا گرے اس کا بھی کوئی قاعدہ ہوگا۔ کالج کی انتظامیہ کمیٹی کے ارکان اور اساتذہ میں نفاق پیدا ہوا۔ ہم سات آٹھ لوگوں کو کالج کے مالکوں نے نکال دینے کے نوٹس جاری کردئے۔ بیلگاؤں کو الوداع کہہ کر ذریعہ معاش کی تلاش کا وقت آ گیا۔ جس گاؤں میں مجھے بے حد پیار ملا وہ گاؤں چھوڑ کر وہاں سے

نکلنا پڑا۔

بیلگاؤں کے پلیٹ فارم پر الوداع کہنے آئے ہوئے دوستوں اور ساتھیوں کا مجمع لگا تھا۔ اُس اسٹیشن پر پونے جانے والا فرسٹ کلاس کا ایک ڈبّہ جوڑ دیا گیا تھا وہ یارڈ میں ہی تھا۔ وشنو کیشن کامت نے براہ راست وہاں لیجا کر سامان رکھ دیا۔ بنگلور میل آ گئی۔ ڈبّہ جُڑ جانے کے بعد دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو اندر راؤ صاحب نے ہمیں معلوم کئے بغیر ہمارا کمپارٹمنٹ اندر سے پھولوں سے مزّین کر دیا تھا۔

میں نے اور میری اہلیہ نے اب تک آنسو کا باندھ روکے رکھا تھا وہ پھوٹ نکلا۔ یہ سارے لوگ کون تھے ہمارے! ایک کالج میں معمولی لیکچرر۔ تھوڑا سا گانے بجانے والوں میں۔ تھوڑا ناٹک سنیما میں رچا بسا۔ یہاں نہ اقربا نہ ساتھی......... کوئی یہاں، کوئی وہاں کہتے ہوئے بسر کرنے والا۔ پلیٹ فارم پر خون کے رشتہ دار کوئی نہ تھے۔ شاگرد، احباب، ساتھ۔ اڈّے پر کے دوست۔ عمر سے، عہدے سے، دولت سے کافی بڑے لوگ۔ اُنھوں نے ان تکلفات سے عزّت افزائی سے ہمیں دم بخود کر دیا۔ گاڑی چلتے چلتے راؤ صاحب چھوٹے بچّے کی طرح روتے ہوئے چلاّئے۔

" کس لئے آئے تھے ہاں بیلگاؤں میں ؟ "

سال بیت گیا۔ پونے ہی میں ہمارا گھر تھا۔ جس دن ہم نے بیلگاؤں چھوڑا تھا وہی تاریخ تھی۔ سنیچر تھا۔ رات کو کھانے کے لئے ہم بیٹھے تھے۔ بیوی نے یاددہانی کی۔

" ٹھیک ایک سال پہلے اسی روز ہم نے بیلگاؤں چھوڑا تھا۔"

دروازے کی گھنٹی بجی۔ تار آیا تھا۔ وینکٹ راؤ مدھولکر نے تار میں لکھا تھا۔ راؤ صاحب رحلت کر گئے۔ کل صبح جلوس جنازہ ہوگا۔ فوراً نکلو۔" دوسرے ایک راؤ صاحب کے دوست فوراً موٹر گاڑی نکال کر بیلگاؤں جانے والے تھے۔ اُنھیں آتے وقت مجھے ساتھ لانے کی تاکید کر دی تھی۔ وہ مجھے لئے بغیر نکل پڑے۔

اس سے قبل پندرہ دن نہیں گذرے ہونگے راؤ صاحب اور کاشی تائی ہمارے گھر پونے میں آئے تھے۔ بیلگاؤں میں آرٹ سرکل کے لوگوں نے ناٹک بٹھایا تھا۔

" فرسٹ کلاس ہو گیا ہے۔ تمھیں آنا ہی ہوگا۔" خواہ مخواہ لگا۔ اُس ناٹک کے لئے، آؤں اس لئے تو جھوٹا تار

کردیا ہوگا؟ کہاں کا کیا؟ اس قسم کے تار جھوٹے نہیں ہوتے۔ پیر کی ڈاک سے راؤ صاحب کے ہاتھوں کا لکھا خط آیا۔ آج رنکیت تعلیم تھی۔ تم دونوں کو ناٹک کے لئے آنا ہی ہوگا۔ ورنہ یاد رکھئے۔ منہ نہیں دیکھوں گا تمہارا۔''

وہ رنکیت تعلیم ہوگئی۔ راؤ صاحب خوش ہو گئے۔ مجھے جلدی سے جلدی میں خط لکھا۔ کسی کو سپرد ڈاک کرنے بھیج دیا اور ناٹک میں کام کرنے والے گروپ کو تھیئٹر میں بیٹھا کر اُن کے لئے بہترین کھانا لانے کی غرض سے بازار خود گاڑی نکال کر چل پڑے، اور گاڑی چلاتے چلاتے سینے میں درد اُٹھا۔ گاڑی روک دی اسٹیرنگ پر گردن ڈال دی وہ آخری۔ ورنہ عام طور پر بیلگاؤں سے شہاپور جاتے ہوئے دس لوگوں سے۔'' شہاپور سے جاکر آتا ہوں رے'' کہتے ہوئے چیختے چلاّتے گزرنے والے راؤ صاحب جہاں سے واپس لوٹنا نہیں وہاں جاتے ہوئے البتہ کسی سے بھی کہے بغیر چلے گئے۔

ایک دو دنوں کے اندر ہی میں بیلگاؤں چلا گیا۔ رِج تھنیٹر کے دفتر کے صحن میں اُس طرح کرسیاں بچھائی ہوئی تھیں۔ مدھولکر، ڈاکٹر ہنم سیٹھ، ڈاکٹر کلکرنی، کاگلکر بُوا، ناٹک ماسٹر، وجا پورے ماسٹر، سارا اڈّے والا گروپ خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ صرف محفل کا بادشاہ نہیں تھا۔ تھنیٹر کے اس ہنگامہ خیز آنگن میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وشنوکیش کامت، سے سسکی روکی نہ گئی۔ کسی نے کہہ دیا پی ایل۔۔۔
''سارا بیلگاؤں غم میں غرق ہوگیا دیکھو۔''

راؤ صاحب کو جا کر اب بارہ سال پورے ہونے کو ہیں۔ ریڈیو کے ستار پر کچھ جھنک جاتا ہے۔ ولولہ پیدا کرنے والی دوستی کا پرانا رشتہ یاد آنے لگ جاتا ہے۔ لیڈی ستارِسٹ کی یاد سے ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی آتا ہے۔

کئی سالوں سے دوبارہ بیلگاؤں نہیں گیا۔ وہاں کے احباب کہیں مل جائیں تو کافی اصرار کر کے بلاتے ہیں۔ بیلگاؤں میں مجھے کھینچ لی جانے والے میرے دوست بابوراؤ رِگے اور وہاں میرا جی لگانے والے راؤ صاحب !بابوراؤ بھی چل بسے۔ راؤ صاحب بھی سدھارے۔ ایشور نے ہماری چھوٹی سی زندگی

سنوارنے کے لئے دئے ہوئے یہ انمول تحائف بن مانگے عطا کئے تھے، بن کہے واپس لے لئے۔

☆ ☆ ☆

(گنگوت)

رُگ ویدی

بہت دنوں کے بعد میں امسال گنپتی کے لئے پارلے چلا گیا۔ میرا گھر اور میرے نانا کا گھر بھی پاس پاس ہی ہیں۔ بڑی سڑک سے اندر گلی میں داخل ہونے کے بعد جہاں وہ گلی ختم ہوتی ہے وہیں پر سامنے میرے نانا کا چھوٹا سا بنگلہ ہے۔ اس بنگلہ کے چھوٹے سے دیوان خانے کی کھڑکی سے سامنے والی اندر کی جانب مُڑنے والی گلی نظر آتی ہے اور گلی کے ناکے پر آئے ہوئے شخص کو اس کھڑکی کا آدمی با آسانی نظر آ سکتا ہے۔

گلی کے ناکے پر میں آیا۔ حسبِ معمول دور نظر آنے والی اس کھڑکی کی طرف دھیان گیا۔ لمحہ بھر کے لئے انوکھا احساس ہوا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے میں اس کھڑکی کے پاس پہنچ جانے پر ، آج برسوں سے بلا ناغہ سُنائی دینے والی پیار بھری آواز سُنائی دیگی ۔۔ نہیں بالکل میرے کانوں پر کہیں سے وہ آواز سُنائی دے رہی ہے ایسا احساس ہوا۔

''آیلو 'رے پُتا؟'' (آیا مُنّے) میں نے کھڑکی سے اندر جھانک کر دیکھا دیوان خانہ خالی پڑا تھا۔ بہت ہی کھلا پڑا تھا۔ دیوار پر صرف نانا کی تصویر ٹنگی ہوئی تھی۔ دوسرے دن آنے والے گن راجا کے لئے آسن تیار کیا گیا تھا۔

''آیلو 'رے پُتا ؟''۔ اب یہ آواز سُنائی نہیں دیگی۔ نانا کے گذر جانے کو ایک سال ہو گیا تھا۔ خالی دیوان خانے میں جا کر میں بیٹھ گیا۔ پورا ننھیال میرے گرد جمع ہو گیا۔ صرف نانا اور نانی کو چھوڑ کر۔ میں اُس کھڑکی

والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ سامنے کے راستے سے دور دیکھنے لگا۔ بچپن میں شام کے وقت ہم نواسے نواسیاں نانا کے آنے کی اس طرح راہ تکتے بیٹھے رہتے۔ دفتر سے وہ تشریف لائے کہ اُن کے گرد ہم جمع ہو جاتے پھر کسی کے ہاتھ پر زرد آلو' کسے بال رامائن تو کسے صرف بوسے' ایسی خیرات ہوتی۔ دیے لگ گئے کہ رامائن، مہابھارت کے قصے شروع ہو جاتے۔ اُن کے دفتر جانے کا لباس۔۔۔ سفید ڈھیلا کرتا' شفاف دھوتی' سر پر سفید رومال' پاؤں میں کوکنی چپل اور پیشانی پر لال تِلک' ایسا ہوا کرتا تھا۔ پیلے ویلچی کیلوں کے سوکھے چھلکوں کی راکھ اور ہلدی چندن کو اُبال کر وہ یہ گندھ تیار کرتے۔ ہمیں وہ خود گندھ لگاتے (اُس زمانے میں ہمیں اسکول میں ' گندھ' کے پانچ نمبر ملا کرتے تھے) اس کے بعد ہم نواسے نواسیاں، پوتے پوتیوں کی جانب سے (اس وقت ہم دو تین ہی تھے، اب بہت ہیں) آفس سے لوٹتے وقت کیا کیا لیتے آئیں اس کی فرمائش کی جاتی۔ شام کو حصولیابی کے لئے ہم اس کھڑکی میں بیٹھ کر اُن کی راہ تکتے رہتے۔ دور اُن پر نظر پڑی کہ گلی کے ناکے تک ہم دوڑ پڑتے اور کسی کے ہاتھ میں اُن کی چھتری' تھیلی۔۔۔ اور پھاٹک تک پہنچتے پہنچتے کسی نہ کسی نواسے پوتے کے سر پر اُن کا رومال چڑھا ہوا رہتا 'اور'' انا آئے، انا آئے، انا آئے'' کی الاپوں میں وہ گھر تشریف لاتے۔

ممبئی شہر کے بالکل قریب ہوتے ہوئے بھی اُس وقت پارلے پر کوکنی سادگی کی چھاپ تھی۔ اب اگر پارلے چلا جاؤں تو بڑھی ہوئی آبادی' گندی ہوٹلیں' اُن میں تینوں زمانے گلا پھاڑتے ریڈیو اور مختلف دیش کے مختلف لوگوں کا مجمع دیکھکر ''ہوگرین واز مائی ویالی'' کہنے کو دل چاہتا ہے۔ ناریل، آم کی ساری باڑیاں عنقا ہو گئی ہیں اور وہاں اب بنگلے تعمیر ہو گئے ہیں۔ ایک دوسرے کو چبا جائیں یا نگل جائیں اس جذبے کے ساتھ بعد از جنگ زمانے کے جبڑے میں پھنسے ہونے کے باوجود زندہ رہنے کی سعی کرنے والے انسان وہاں بھیڑ بنائے بس رہے ہیں۔ پارلے یہ ایک زمانے میں چھوٹا کنبہ تھا۔ جوشی کے یہاں بچّے کی رسم جنیو ہوئی تو نامُستار سے لیکر خوشال سیٹھ تک سبھوں کے گھر میں تقریب منعقد ہونے کا لطف پیدا ہوتا۔ گاؤں میں کھاناول (لنگر خانہ جہاں مناسب داموں میں کھانا ملتا ہے) کا اچھی طرح چلنا ممکن نہیں تھا۔ کوئی بھی کسی کے بھی گھر جا سکتا تھا۔ وہ گھر اس کے لئے اجنبی نہ ہوتا۔ اب وہ لوگ جو انسانیت نواز دور میں گذر بسر کرتے تھے آج ایک

دوسرے کے لئے اجنبی بن گئے ہیں ۔اس وقت ہر کس کی کہیں نہ کہیں عقیدت مندی تھی ۔ کہیں نہ کہیں لگاؤ جُڑا ہوا تھا۔ چھوٹا سا تِلک مندر۔ رات میں چرچ کی طرح گھنٹا بجا کہ لوگ ویا کھیان ۔ پُران کے لئے جمع ہوں ویسے گھر میں پابندی سے جمع ہو جاتے ۔ ویا کھیان کی تشہیر کرنے کی ضرورت نہ پڑتی ۔ صبح اکھاڑے کی دھوم رہتی ۔ چار مہینوں (اشاڑھ تا کارتِک) میں ایک لاکھ نمسکار پورا کرنے کا نمسکار اچاریہ سومن کا عہد' گھر کی مذہبی رسومات کی ادائیگی کی ذمہ داری کی طرح' سارے پارلے کی ہی رہتی ۔

دادا صاحب پاردھی' چاندی والے پرانچپے' میرے نانا' ایسے اس کنبے کے کرتا دھرتا لوگ ۔اُن کے کہنے پر پارلے چلا کرے، اُنھیں بھائے ایسا پارلے بولے ۔گاؤں کے کسی بھی غلطی کرنے والے بچّے کا کان یہ بزرگ ہستیاں بہ حیثیت آبا و اجداد مروڑ لیں ۔ کسی بھی بچّے کی ہمّت افزائی کے لئے اس کی پیٹھ سہلانے یہی بزرگ آگے بڑھتے ۔اپنے بھلے بُرے برتاؤ سے پارلے کو نیچا دیکھنا پڑیگا اس کا احساس بچپن ہی سے ہمارے من میں رچا رہتا تھا۔ اِن سارے اجداد کی دیکھ بھال میں سوڈیڑھ سونواسے پوتے پروان چڑھ رہے تھے۔ چاندی والے پرانچپے شری منت جنھوں نے تِلک وِدیالیہ کی مالی ذمہ داری کا بوجھ اپنے سر اُٹھایا ہوا تھا۔ دادا صاحب پاردھی سخت فوجی مزاج والے۔ کاندھے جھکائے پارلے کا کوئی لڑکا یا لڑکی چل رہی ہو تو دادا کی زور دار دھپ پڑی پیٹھ پر۔ اُن کے باغ کے آنگن میں پورے گاؤں کے بچّوں کا کھیل کا میدان تھا۔ کشتی کے لئے ریت ڈالی ہوئی ۔ پچاس لوگ بہ یک وقت تیر سکیں ایسا تالاب جیسا وسیع و عریض کنواں کھودا ہوا۔ اور ہمارے انا۔ اُنھوں نے سارے لڑکے لڑکیوں میں حُسنِ اخلاق پیدا کرنے کی ذمہ داری لی تھی ۔کہیں کرتن کی مجلسیں منعقد کر تو کہیں فنسلکر ماسٹر جی کو لیکر گیتا کی کلاس چلا' پانڈو پرتاپ ، ہری وِجیا کے قصّے سوڈیڑھ سو بچّوں کو جمع کر کے سُناتے بیٹھ جائیں ایسے کام چلتے رہتے تھے اُن کے ۔ سمرتھ رام داس' چھترپتی اور لوک مانیہ یہ تین، سارے گاؤں کے لئے قابلِ تقلید ! پونے والوں جیسا ہنگامہ تو نہیں تھا لیکن پونے والوں کیطرح کام کرنے کا ایک جذبہ تھا۔ غریب کلرک پیشہ افراد کا یہ گروہ اپنی آنکھوں کے سامنے ہمالیہ جیسے بلند اُصول رکھ کر راہ چلنے کی سعی کر رہے تھے ۔ جنگِ عظیم کی مہنگائی کی ضرب لگی اور سبھوں کی کمریں ٹوٹ گئیں ۔ کسی کے دِماغ میں دولت کا نشہ چڑھ گیا تو کچھ غربت کا شکار ہو گئے ۔ پارلے کی ریڑھ کی ہڈّی ہی ٹوٹ گئی ڈھیلے ڈھالے

ہنار یڑھ والے خود غرض انسانوں کے جمِ غفیر میں ہمالیہ جیسے بلند اقدار کب کے پگھل گئے۔ لوگ بے حس اور دوراز دھرم ہو گئے۔ ایک خوبصورت بستی پر نئی تہذیب کا بنا پھر گیا۔ انسان بن کر جینے والا یہ گروہ زمین کی سطح برابر ہو گیا۔ زندگی بھر سینے سے لگائے رکھے ہوئے اقدار کی بربادی دیکھکر میرے نانا اور اُن کے معاصر اصول پرست لوگوں نے نئے حالات کے صدمے سہتے سہتے اپنی جان گنوادی۔

میرے نانا کے انتقال کے بعد میرے ایک ایڈیٹر دوست کا مجھے خط آیا کہ تم اُن پر مضمون لکھو۔ تمھارے نانا ''دیا نہ باتی '' ایسی حالت میں بھُلا نہ دیے جائیں۔ مجھے لگا' راج گھاٹ کی سمادھی یہ دُنیا کے آخری '' انسان '' کی سمادھی جہاں ہم نے ڈھونگی نمسکار کی غرض سے رکھ چھوڑی ہے وہاں بیچارے میرے ''وامن منگیش دُبھاشی'' نام کے نانا کس کھیت کی مولی ! ۔۔۔ راج گھاٹ پر سے یاد آیا۔ میرے نانا کے قد وقامت اور رہن سہن میں گاندھی جی سے خوب مشابہت تھی۔ ''نہ دیا نہ باتی ''۔

مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے جب میں ہائی اسکول میں زیرِ تعلیم تھا۔ گوا کے مشہور شاعر بورکر۔ اُس زمانے میں وہ اس قدر مشہور نہ تھے۔ ہمارے نانا سے ملنے آئے تھے۔ آج ایک شاعر اپنے گھر تشریف لائے گا' اس لئے میں پاٹ کے نیچے رکھ کر اِستری کیا ہوا پاجامہ اور قمیض پہن کر شاعر کا انتظار کرتے بیٹھا تھا۔ نیلا سوٹ پہنا ہوا اور خوب لمبے وخوبصورت بالوں والا یہ شاعر کچھ گنگناتے ہوئے آیا اور اُس نے سیدھے میرے نانا کے پاؤں پر اپنا سر رکھ دیا۔ مجھے خواہ مخواہ شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ اتنا خوبصورت سوٹ زیب تن کیا ہوا شاعر ہمارے چوٹی والے نانا کے پاؤں پر سر رکھکر نمسکار کرنے جیسا باولا ہوگا ایسا اُس وقت مجھے محسوس نہیں ہوا۔ آج جب یہ یاد آیا یعنی اُس روز اُس دیوان خانے میں سب میں باولا میں تھا' یہ سمجھ میں آ گیا۔ بورکر نے اُس دن کتنی خوبصورت نظمیں کہیں! لفظوں سے زیادہ لئے کی بنا بر اُس وقت۔ وہ نظمیں میرے ذہن میں رہ گئی تھیں ۔

لے ''چیل تجھے چرن ذراہیا گھری اِستھراوے ، تیھے کرما جھے زَلتی ''۔ اب تک یہ منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے ۔ یَدھنی دے اُنی جیانی نیز شر ر گھڑ لے مانو تے چے مندِر ر پری جیا نچیا دہن بھوجی ور ر ناہی چیرا ناہی پنتی ۔۔۔ ''جنھوں نے (انسانیت کی) جنگ میں اپنا سر نچھاور کر کے انسانیت کا مندر کھڑا کیا لیکن اُن کی آخری آرام گاہ پر نہ دیا ہے اور نہ باتی ''۔

(! تیرے تیز قدم کچھ پر یہاں ٹھہر جائیں۔ وہاں میرے ہاتھ جُڑ جائیں۔)

یہ مصرعے سُنتے وقت نانا کی آنکھوں سے پانی کی دھارین نکل پڑی تھیں۔ زندگی کو یدھینا کی تشبیہ پہ روندر کی پسندیدہ تشبیہ زگتے آنند یدھینے آمار نمنترن ۔

آنند یدھینا سی آلے نمنترن' مانوی جیون دھنیہ زھالے ! خوشی خوشی جان نچھاور کرنے دعوت آئی انسانی زندگی کا مقصد حاصل ہوا ۔

بور کر تو ہوڑ زاتلو 'پُتا'' (بور کر، تو بڑا بننے والا ہے ، بیٹا!) بور کر کو گلے لگا کر نانا نے دعائیں دیں ۔ مجھے یاد آتا ہے' اِتکیا ٹن نہ اَے اَی مرنا '' (اتنی جلدی موت نہیں آئیگی)

اس نظم کی زندگی کی خوشیوں کی فہرست میں'' ماسلی چا سوادُ نا'' (مچھلی کی دونی لذّت) کھانے کے تصوّر سے میری نانی فوراً ہنس پڑی اور دھیرے سے'' آبا! اَچ گا ئکار گوہا!'' (اری بائی! سچّا گوواوالا ہے یہ ہاں !) ایسا میری ماں سے کہا۔ نانا کے دیوان خانے میں نانی کو بھی با احترام جگہ حاصل تھی۔ بہت زیادہ دانشورانہ گفتگو نہ ہو، تو شعری ادب کی مزاحیہ گفتگو میں نانی بھی شامل ہو جاتی ۔ نانا کے ساتھ رہ کر نانی بھی اُن کے رنگ میں مکمل رنگ گئی تھی۔ اُن کے حِس مزاح بہت تیز تھی۔ نانا کے بے پناہ دانشورانہ برتاؤ کی وجہ سے اُنھیں نانی کی طرف سے دھرم راج' ہریش چندر وغیرہ پُران والے خطاب مِلے ۔ نانا کی گفتگو و بحث سے زیادہ ہمیں اُس کی گفتگو و بحث اچھی لگتی۔ کوکنی محاوروں کا استعمال اس کی باتوں میں زیادہ رہتا۔ اپنی بات کسی پیپل کے اپاہج ' کسی تو تلے چرواہے وغیرہ کو دھیان میں رکھ کر پیش کرتی ۔ اکثر وہ نانا کو لا جواب کر دیتی ہوگی کیونکہ نانا اُس پر خفا ہوتے اور نانی ''لوکا سانگے برہما دیان'' (لوگوں کو بڑی بڑی باتیں سنائے) جیسا فقرہ چھوڑ کر بات کو ختم کر دیتی ۔

۱

پر کچھ ہو لیکن اپنے نانا بہت بڑے دانشور ہیں ایسا مجھے محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اُن کی مجموعہ کُتب میں سے ایک بھی کتاب ہماری دانست میں قابلِ مطالعہ نہ تھی۔ جدید رومانی ادب کی اُنھیں بھنک نہیں تھی۔ ہری بھاؤ آپٹے کے بعد ناول لکھے جا رہے ہیں اُس کا اُنھیں علم نہ تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ پونے گئے تو وہ ہری بھاؤ کے درشن لینے۔ ہری بھاؤ آپٹے' فرگیوسن کالج اور شنی وار واڑہ اِن تینوں کو نمسکار کر کے وہ واپس لوٹے، جدید

ادب سے متعلق اُن کی محدود معلومات دیکھکر مجھے بُرا لگتا ۔اس کے باوجود کا کالیکر جیسے لوگ انا کو کیوں بڑا مانتے ہیں' اس بات پر تعجب ہوتا۔ کبھی کبھی لگتا کہ لوگوں کے بہت کم سمجھ میں آتا ہوگا تو کبھی کبھی لگتا انا کو بیکار کی جھنجھٹ میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی ۔

وہ کرتن کرتے تھے لیکن گانے سے زندگی بھر مخالفت رہی ۔ کتھا لیکن وہ بہت سیدھے طریقے سے سناتے تھے ۔اُن کی مراٹھی بات چیت میں کوکنی کی ہلکی سی لچک تھی ۔ میری ماں کوکنی اور والد بیلگاؤں کے۔ میرے نانا مجھے کوکن مراٹھا کہہ کر پُکارتے ۔اُن کی کتھا سُنتے بڑے بڑے لوگوں کا دل بھر آتا۔ وہ دین اُنھیں پرنانا کی جانب سے ورثے میں ملی ۔لوگ ہریش چند' چلیا' ان کا ذکر سُنتے سُنتے بالکل رو پڑتے ۔ مجھے بھی رونا آتا ۔لیکن لوگ ہنسیں گے ایسا خواہ مخواہ ہی ڈر لگتا !صرف نانا گانے پر اُتر آئے تو سُننے کا جی نہ کرتا۔ سارے ابھنگ ،شلوک سبھی ایک ہی لئے میں سناتے ۔ بعدازآں میں بڑا ہوجانے پر اُن کے بیانات میں گانا سُنانے کی ذمہ داری مجھ پر آئی ۔ میں خوب لطف لیکر گانے میں مگن ہونے لگا ، کہ انا دھیرے سے 'کافی ہوا' ایسا اشارہ کرتے ۔اُن کے اشارے پر عمل نہیں کیا تو بالکل بے سُرے آواز میں ''سیتا کانت سمرن جے جے رام'' کہہ کر پردہ گرا دیتے اس کے برخلاف میرے والد اور ماں کو گانے کا بے حد شوق !اتفاق بھی اتنا بھیانک تھا کہ میرے والد کے انتقال سے ایک گھنٹہ قبل ہی گھر میں گانے کی نشست پوری ہو چُکی تھی ۔ میری ماں کی آواز بھی میٹھی ۔ ہمارے دو تین گانے گا کر ہوئے کہ نانا کہتے ۔''بہت ہوا بابا تمھارے گلے میں درد ہونے لگیگا'' ۔

ایک بار وہ میرے گانے کے پروگرام میں آئے ۔ آخر تک بیٹھے رہے ۔بس کرنے کے اشارے جاری ہی تھے ۔گانا ختم ہونے پر مجھ سے کہا ۔

''پرشوتم' تجھے گانے یاد نہیں ہیں تو پھر کیوں گاتا ہے؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا'' ۔یاد نہ رہتے ہوں تو لکھ لئے جائیں !میں کون سا گانا گاتے ہوئے بھول گیا' وہ مجھے یاد نہیں آرہا تھا۔ ''ماوشی می آپلا بگھتوئے ۔یدو منی سدنا ۔۔یدو منی سدنا'' ۔۔ پچاس بار وہی وہی دہرا رہا تھا۔ ہاتھ میں کاغذ لیا جائے اور صاف ستھرا گانا گایا جائے ایک بار !دوبار گایا جائے 'یعنی اگر کسی کی سمجھ میں نہ آیا ہو' تو مطلب صاف سمجھ میں آجائیگا !فنِ گلوکاری اور کھاڈلکر کے نغموں کا مطلب ان دونوں سے متعلق ان کا بھرم زندگی بھر مجھے دور کرنے نہیں آیا میں بعدازآں

ناٹک میں داخل ہونے کے بعد وہ کبھی ناٹک دیکھنے آئے تو نہیں، لیکن ہمارے فن کی قدر دانی کے طور پر تری پھل چورن کی ایک بوتل اُنھوں نے مجھے دی تھی۔ ''شب بیداری کرتا رہتا ہے بلا ناغہ استعمال کیا کر''۔ انا کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ناٹک کرنے میں جاگنا پڑتا ہے۔ اُنھوں نے ایامِ جوانی میں ''سماجونتی '' نام کا ناٹک لکھا تھا۔ مراٹھی تھیٹر کی خوش نصیبی سے اُسے کھیلنے کی کسی نے جسارت کی ہی نہیں ۔

میری ماں یہ اُنکی اکلوتی بیٹی۔ اُن کے دل میں اُسے خوب پڑھانا تھا۔ پر وہ زمانہ، ہماری پرانے خیالات کی نانی اور مالی دشواریاں یہ تینوں چیزیں اس کی تعلیم کی راہ میں حائل ہوئیں۔ میرے نانا خیالات سے اصلاح پسند۔ ایک دوسری بار شادی کروانے میں پروہت کے فرائض انجام دئے تھے۔ لیکن گھر میں روزانہ پشت در پشت چلی آرہی پوجا ہوتی تھی۔ منگیش یہ اُن کے خاندانی دیوتا۔ دراصل دو بھاشی خاندان یہ گووا کا۔ کچھ عرصے بعد اُن کے اجداد کاروار چلے گئے۔ سارے رسم و رواج جوں کے توں پالے جاتے۔ پکائے ہوئے کھانے دیوتا کو دکھائے جاتے لیکن وہ پوجا پاٹ کے کپڑے نہ پہنتے ہوئے دُھلے کپڑے پہنتے۔ ایک بار کہے ہوئے وقت پر اُپادھیائے بوا نہیں آئے یوں ہی نہ آتے تو کوئی بات نہ تھی، کسی امیر میزبان کے گھر سے بُلاوا آیا اس لئے اُنھوں نے اس دعوت کو نظر انداز کر دیا۔ نانا نے میری ماں کو پوری پوجا سکھا دی تھی یہاں تک کہ گنپتی کی پران پرتشٹھا (دیوتا کی شکتی مورتی میں لانا) پوجا بھی۔ ماں پوجا کے بول پڑھتی جاتی اور نانا پوجا کرتے۔ صرف شرادھا (موت کے بعد مرنے والے کی خاطر کھلائے جانے والا) کا کھانا بھٹ جی کو پہنچا دیتے۔ اُپادھیائے بُوا کی اُن کے سامنے بولنے کی ہمت نہیں تھی۔ بہت سی باتوں میں وہ اپنی سوچ کی مطابق بھی عمل کرتے۔ جوتش اور منتوں پر اُن کا یقین نہیں تھا، اصل کاروار ی زبان میں وہ ''شری منگیشا'' سے مصائب دور کر کے سبھوں کو سُکھی رکھنے کی بنتی کرتے۔ گھر میں کوئی بیمار پڑ جائے تو دیوتا سے اپنی زبان میں بات کر کے نظرِ عنایت رکھنے کی گذارش کرتے ۔

آگرکر رانڈے یہ اُن کے مطمحِ نظر، کبھی کبھار، مہاراشٹر کی سب سے عظیم شخصیت آگرکر یہ اُن کی رائے سُن کر ،تِلک ہائی میں انگریزی چوتھی پانچویں میں زیرِ تعلیم مجھے اُن کی لاعلمی پر رحم آتا اب خود پر آتا ہے۔ یہ آدرش اپنے سامنے رکھ کر اُنھوں نے سماجی اصلاح کے کام کی شروعات کاروار جیسے جگہ سے کی۔ سولہ سترہ

سال کے اِن دو چار جوانوں نے'' نہرو اسکول '' قائم کیا ''مِتر سماج '' نکالا۔ کا کا کالیکر یہ اُن کے وہاں کے شاگرد۔ اُنھوں نے ''سمرن یاترا ''میں ''وامن ماسٹر'' نام سے میرے نانا کا ایک خوبصورت قلمی خاکہ پیش کیا ہے۔ میرے نانا کی سمادھی نہ ہو۔ اتنے بڑے وہ نہ بھی ہوں شاید۔ پھر بھی کالیلکر جیسے عظیم شاگرد نے ایک خوبصورت باتی مگر یاد سے رکھ دی ہے۔ انا کو فن تقریر کی دین حاصل تھی، خوش دلی بھری حس مزاح تھی، محنت کی تکلیفیں برداشت کرنے کی قوت تھی۔ اور اِن سب کے ساتھ سنت ساہتیہ کے مسلسل مطالعے سے حاصل ہوئی مزاج میں نرمی تھی۔ وہ اپنے مخالف پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ اُنھوں نے ''رگ ویدی'' یہ قلمی نام، میں تحقیق کتاب کے لئے ایک معمولی محرّر ہوں اس لئے اس کا اہل نہیں ہوں اس پُر خلوص خیال سے، رکھ لیا تھا۔ بمشکل تمام تک اُنھوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن اعلیٰ پلان حاصل کر کے اُسے عمل میں لانے کی اُن میں زبردست طاقت تھی! میرا بڑا ماموں بہرا ہونے کی وجہ سے اُسے تعلیم دینا ممکن نہیں تھا۔ اُس میں فن مصوّری کا شوق پیدا ہوا اِس لئے خود مصوّری سیکھی۔ کاروار میں قدرتی مناظر بے شمار۔ وہاں کے مناظر پر سیاح فدا ہوتے۔ یہ دیکھکر اُنھوں نے قابل ستائش مناظر کی تصویریں اُتار کر اُس کا کاروبار بھی کیا۔ لڑکپن میں سرسوتی کی پوجا کے لئے بچّوں کی طرح ایک کے ہندسے کی سرسوتی نہ نکالتے ہوئے میرے نانا نے نکالی ہوئی صحیح مور پر بیٹھی ہوئی سرسوتی رہتی۔

نہرو اسکول اچھی طرح چلنے لگا اس کے بعد گھریلو تکالیف کی پناہ پر وہ ممبئی نوکری کی تلاش میں آئے۔ پھر بھی نوکری سے زیادہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی سنگر ہالیے (لائبریری) اُن کے ممبئی آنے کی کشش کا خاص باعث تھا۔ اُس لائبریری کی ممبر شپ حاصل کرنے کی طاقت نہیں تھی لیکن وہاں کے اُس زمانے کے لائبریرین اُن کے دوست تھے۔ اُن کی پہچان کا اُس لائبریری سے اُنھوں نے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ اُنھیں ایک چھوٹی سی نوکری ملنے پر ''تہواروں کی تاریخ '' لکھنے کا پروجیکٹ اُنھوں نے چھوڑ دیا۔ اس کتاب کے لئے اُنھوں نے ضرورت سے زیادہ تکلیفیں اُٹھائیں۔ وید، برہما، پُرانوں کی تاریخ، علمِ نجوم، شاعری، یادداشت، مسلم سیّاحوں کی مضامین، سکّے، کُتبات اُن سب کا باریکی سے مطالعہ کر کے اُنھوں نے یہ کتاب لکھی۔ آنجہانی واسو دیو گوند آپٹے نے پیش لفظ میں اس کتاب کو ''سماجی اصلاحی افکار کی اوتاری تخلیق'' قرار دیا۔ البتہ جاری

محرّر پیشے میں اس کتاب کی تیاری میں لگنے والے تحقیقی مطالعے کے لئے وقت نہیں مل پاتا، اس لئے اِدھر اُدھر سے چار پیسے جمع کر کے اُنھوں نے ایک پنساری کی دُکان ڈالی۔ بیوپار میں پیسے کمانا ہوتے ہیں ایسا لیکن اُن کا مقصد نہ تھا۔ دکان کبھی بھی بند کر کے لکھنے پڑھنے مل جاتا ہے، یہ سہولت اس میں اُنھیں دکھائی دے رہی تھی۔ ترازو سامنے رکھ کر قدیم سکّے جانچتے بیٹھے ہوئے اس بنئے کے ہاتھ میں رائج سکّے بمشکل ہاتھ آئے اور سارا بیوپار ٹکا۔ بنئے (تکارام مہاراج کی طرح سادہ لوح) کی روایت پر پورا اُترنے والا ثابت ہوا۔ دُکان میں طلبہ کی بیاضوں کی ردّی آتی۔ اُس کی کوری پشت پر وہ نوٹ لکھکر رکھتے۔ اُن کا خط ہی خوبصورت تھا۔ باریک پڑھنے لائق کتابوں سے نکالی ہوئی یہ بیاضیں اُنھوں نے اپنی بڑھتی غربت کا مقابلہ کرنے کے لئے ردّی کے مول کتابوں کے ساتھ بیچ ڈالیں! پنساری کی دُکان بند کر کے ایک بار پھر وہ پیشے (کلرکی) محرّری میں گھسنے لگ گئے۔ وہاں بھی اُن کا مراٹھی ایمان اور لگن برقرار تھی۔ ایک جاپانی کپاس کی فروخت کرنے والی کمپنی میں وہ نوکری کرنے لگے۔ اُسی دوران اندھیری کے قریب جوگیشوری میں اپنے ساتھیوں کے اُنھوں نے ایک ہاؤسنگ کوآپریٹیو سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور اپنی استعداد سے باہر سیکنڈ کلاس کا پاس نکالا۔ اندھیری تا قلابہ سیکنڈ کلاس ریلوے ڈبہ ان کی جائے مطالعہ تھی! اُس وقت جھک جھک گاڑیاں تھیں۔ سیکنڈ کلاس میں بالکل بھیڑ نہ رہتی۔ اندھیری سے قلابہ پہنچنے کافی وقت لگتا اس لئے ریلوے ڈبّے میں آتے تھے اطمینان سے مطالعہ ہوتا۔ بمبئی میں وہ پہلی بار آئے، اُس دن نوکری کی تلاش کرنے سے پہلے ممبئی یونیورسٹی کے اطراف بلا مبالغہ پھیرے ڈالے۔ راجابائی ٹاور کی اونچائی سے جتنے وہ مرعوب نہیں ہوئے، اُتنے ہی وہاں کی لائبریری کی کتابیں دیکھ کر خزانہء علم کے کمرے کو دیکھ کر محوِ حیرت ہوئے۔ تحریری اور زبانی دونوں سطح پر لفظوں کی پاکیزگی برقرار تھی ایسا وہ زمانہ تھا۔

ٹیگور کو ''گیتانجلی'' پر نوبل انعام ملنے پر اُنھوں نے بنگالی سیکھنا شروع کی۔ اور اس کے بعد ''ابھنگ گیتانجلی'' اُس کا مراٹھی ترجمہ کیا۔ اُن کی شعری تخلیق میں خداداد نعمت کا عنصر ہوتا۔ تیز رفتار ہوتی۔ سنت شاعری کی مسلسل مطالعے نے لفظوں کا بھرپور خزانہ عطا کیا تھا۔ بطور شاعر اُن میں تخلیقی مزاج کی پھرتی نہیں تھی۔ حالاتِ حاضرہ پر تو وہ خوب شعر کہتے۔ ٹیگور کو تو وہ ''گیتانجلی'' کی اشاعت کے بعد اُن کے ممبئی کے

قیام کے دوران ملنے گئے۔ اور ''ابھنگ گیتا نجلی'' کا نسخہ ان کے قدموں میں رکھ کر، اُنھیں کے ہم عمر میرے نانا نے، ٹیگور کو ان کے قدموں پر سر رکھکر نمسکار کیا۔ گاندھی نے ہندی کے لئے کئے ہوئے پُر سکار کے بعد اُن کے ذہن میں ہندی کے لئے دیوانگی شروع ہوگئی۔ گھر میں ہندی کا جبر شروع ہوگیا۔ ایک بار سروجنی نائیڈو کے انگریزی لیکچر کے بعد اُنھوں نے ہندی میں اظہارِ تشکر کیا۔ درحقیقت اُن کی مادری زبان کاروباری، ساری تعلیم کنڑی زبان میں پائی، انگریزی سے اُنھیں عقیدت تھی، سنسکرت اُن کے مطالعہ کا پسندیدہ مضمون، اُن کے تخلیقات مراٹھی میں لیکن بنگالی یہ گرودیو کی اور ہندی گاندھی جی کی پسندیدہ زبان اس لئے ان دونوں زبانوں کا بڑی محنت سے مطالعہ کیا اور کپاس کی تجارت میں گجراتی کے بنا کام نہیں چلتا اس لئے گجراتی از بر کرلی۔

ان کے علاوہ اپنے پیچھے بے شمار لقب لگالینا (کام کرنا) یہ اُنکا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ گھر کے حالات اُن کی شوقیہ طبیبی کی بنا پر ہمیشہ بڑھتی رہتی۔ کبھی ہومیوپیتھی، کبھی آیوروید تو کبھی بایوکیمیسٹری ایسے تجربات ہر وقت چلتے رہتے۔ کئی اداروں کی مجلسِ منتظمہ میں ہونے کے باوجود وہ کام کرنے کا باولا پن کرتے۔ ممبئی کے پرارتھنا سماج کی ذمہ داری قبول نہ کرنے کے باوجود وہاں کے اصول پرستوں کی صحبت قبول کرلی پڑھانے کا فطری شوق نائٹ اسکول قائم کرکے پورا کرلیا ۔ وہ شوقیہ وکیل، ڈاکٹر، انجنیر وغیرہ سب کچھ ہونے کی وجہ سے وہ اُپنیشد سے لیکر سمینٹ کے نرخ تک کسی بھی موضوع پر مفت مشورہ دیا کرتے تھے۔ کسی نے نیا گھر بنانے کی ٹھانی کہ اُس کے مالک سے زیادہ ان کا جوش وخروش رہتا، خاص کر جھگڑے چکانے والے ثالث کا کام تو اُنھوں نے کئی بار کیا، جھگڑا چکا دیا گیا کہ فریقین کے لوگوں کو کھانے کا اصرار کیا جاتا اور یہ گروپ کھا کر خوشی خوشی لوٹ گیا کہ نانا اور نانی میں عین وقت پر مہمان آنے پر جھگڑا شروع ہوجاتا نانی دھرم راج ' تُکارام ' جگ متر جیسے خطابات سے نوازتی اور نانا سقراط کی سی خاموشی سے یہ سب کچھ سُن لیتے !

میں نے مگر اُن کا سنسار دیکھا، وہ سارے طوفان تھم جانے کے بعد۔ لڑ کے کرتے سنورتے ہوگئے۔ اچانک بلڈ پریشر کی تکلیف کی وجہ سے اُنھوں نے ایک انگلش کمپنی کی بڑے عہدے کی جگہ چھوڑ دی اور ''ہندو دھرم دیپکا'' یہ لغت جیسی کتاب لکھتے اطمینان سے گھر بیٹھ گئے۔ پارلے میں چھوٹا سا بنگلہ باندھا تھا ''دیپکا

میں اُنھیں خوب مالی دشواری اُٹھانی پڑی۔ جاپانی کمپنی میں برسرِ روزگار تھے اُن دنوں بیوپاریوں سے بنی جان پہچان کے سبب گجراتی مالداروں کی مدد سے کچھ کاپیاں اُنھوں نے بیچ ڈالیں۔لیکن نقصان بے حساب اُٹھانا پڑا۔اپنی کتاب کی سماج کو اب ضرورت نہیں رہ گئی ہے ایسا تصور کرلیا اور عمر کے آخری حصے میں عرض و گذارش کے خطوط لکھکر ''گیتانجلی'' اور ''دیپکا'' کی فروخت شروع کردی۔جو کچھ آمدنی تھی وہ ساری گھرباندھنے میں اور کتابیں شائع کرنے میں صرف کردیں۔اُس گھر کے چھوٹے سے دیوان خانے میں محیط نانا اور نانی کا سنسار تھا۔نانی کی طبعیت ناساز ہوئی اور ایک دوسرے کی خدمت کرتے یہ معمّر جوڑا ایکا یک اس طرح رہنے لگے۔ جس مفلسی کی حالت میں وہ ممبئی آئے، وہی حالت۔۔۔رہتا گھر چھوڑکر۔۔پھر حاصل ہوئی۔لیکن اب نغمے تھک چکے تھے۔زندگی میں خستہ حالات میں ساتھ نبھانے والی ساتھی بستر سے لگ چکی تھی۔اپنے سنسار کے سُکھ دُکھ کے قصے نواسوں نواسیوں کو سُنانے کا ایک کام انا کے پاس رہ گیا تھا۔اپنی اب کسے بھی ضرورت نہیں ،یہ نا اُمیدی بھرا خیال اُن کے دل کو جلا رہا تھا ۔اُسی وقت نانی کا انتقال ہوا اور انا تنہا رہ گئے۔اُس سے پہلے میرے والد کا انتقال ہوا۔اکلوتی لڑکی پر آئی ہوئی اِس مصیبت سے وہ بالکل نڈھال ہوگئے۔اُن کے لطیف ،اُمنگ بھرے مزاج میں ایکدم فرق آگیا۔دیوان خانے کی کھڑکی میں دور تک خاموش نظر جمائے بیٹھنا یہ اُن کا پسندیدہ کام بن گیا۔زندگی میں خلا پڑ گیا۔

جدید افسانوی ادب میں اُنھیں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔میں نے ایک بار اُنھیں مہاراشٹر کے معروف ناول نگار کا ناول اُنھیں پڑھنے دیا۔وہ اُنھوں نے پڑھا اور مجھ سے کہا ''پرشوتم' بہت خوبصورت زبان استعمال کی ہے اس قلم کار نے،لیکن کیوں رے اس ناول کے کردار کیا حقیقت میں اتنے اچھے ہیں،تعلیم یافتہ ہیں،محنتی ہیں،پھر خود کا بیاہ رچانے کی کوشش سے پرے دوسرا اور کچھ اچھا سا کیوں نہیں کرتے''۔

فنِ مصوری سے لگاؤ کی وجہ سے ترنگی سرِورق اُنھیں کچھ خاص پسند نہ آتے !ایک خاتون قلم کار کے ناول کا سرِورق دیکھ کر اُس قلم کار کے حُسن کے بارے میں اُنھیں غلط فہمی ہوگئی تھی۔جدید شاعروں میں وہ کیشوسُت ،تانبے اِن سے پرے کچھ زیادہ نہیں بڑھے۔جدید دِودانوں میں ن۔ر۔پھاٹک کے بارے میں اُنھیں خاص احترام تھا۔''ذہانت نرہر رگھوناتھ جیسی ہونی چاہیئے اُن کے دماغ میں ایشور نے فوٹوگرافی کی

کا نچ رکھ دی ہے'' کہا کرتے ۔ اُن کی ''گیتا نجلی'' ساہتیہ سمیلن میں تک پھاٹک نے پہلے پہنچادی تھی ۔ پرسوں کاروار کے ساہتیہ سمیلن میں بڑے بڑے وِدوانوں کے سامنے اپنے نام کا ذکر ہوا یہ حقیقت اُنھوں نے مجھے بذریعہ خط شہرت کے دروازے پر دستک دینے والے قلمکاروں کی سی امنگ کے ساتھ لکھی ۔ کئی سالوں بعد اپنا نام اخبار میں شائع ہوا دیکھکر ''ابھی تھوڑی سی یاد ہے لوگوں کو میری'' ایسے الفاظ کہے اُنھوں نے ۔ کاروار کے ڈاکٹر کیکنی یہ اُن کے ہندو اسکول کے شاگرد ۔ کالیکر اور کیکنی یہ دونوں ہر سال بلاناغہ اُنھیں ملنے کے لئے آتے ۔

قلم کار اس شئے سے اُنھیں عقیدت تھی ۔ اچھا بُرا کیسا ہی کیوں نہ ہو، فلاں شخص قلمکار ہے یہ چیز ان کے لئے قابلِ احترام تھی ۔ وہ ادب جدید کا زیادہ مطالعہ نہیں کرتے تھے اس لئے یہ احترام آخر تک برقرار رہا ۔ میں سنیما ناٹک میں ہوں یہ اُن کے نزدیک کوئی باعث خوشی بات نہ تھی ۔ میں جب لیکچرر بنا اُس وقت مگر اس کا سینہ تن گیا ۔ ان کے نظروں کے سامنے بھانڈرکر، رینگلر پرانچپے جیسے پروفیسر تھے، اُن میں پوشیدہ عزّت احترام کا پہلو چھوڑ دیا جائے، تو ان کے جتنا اس واقعہ سے خوشی ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی ۔ مجھے لکھے جانے والے خطوط میں پروفیسر ''پُرشوتم کو بے شمار آشیرواد'' جیسے القاب والا جملہ نہ بھولتے ہوئے وہ لکھتے مجھ سے وہ کہتے'' ارے، اب تو پروفیسر ہوگیا ہے، ذرا سنجیدگی سے رہنا سیکھ ۔ لوگ وِدوان جان کر تیری طرف دیکھیں گے .... '' دورِ جدید میں پڑھانے والے کے لئے کچھ زیادہ جاننا ضروری نہیں، یہ '' وِدھا وینان وِستارا'' سے زیادہ اور کچھ نہ پڑھنے والے ہمارے پرانے زمانے کے بھولے نانا کو کیا معلوم ؟ مجھے صرف اتنا اطمینان ہو رہا ہے کہ اُنھیں یہ لاعلمی کا سُکھ اُنھیں میں اُن کی عمر کے آخری حصّہ میں تھوڑا بہت دے سکا ۔

آخری وقت دیوان خانے کی اس کھڑکی میں وہ خوب بیٹھے رہتے ۔ پچھلے کئی سالوں سے وہ ایک وقت ناچنی کی روٹی اور کوئی بھی پتّوں کی سبزی یہ اُن کی خوراک تھی ۔ بلڈ پریشر کا مرض بڑھتا جا رہا تھا ۔ یادداشت نہ رہتی ۔ بے حسی کی حالت میں رہتے ۔ کبھی کسے پہچان لیا تو پہچان لیا، باقی وقت اطمینان سے کھڑکی میں بیٹھے رہتے ۔ روزانہ کی پوجا پاٹ وغیرہ سب کچھ رک گیا تھا ۔ ایک بار میری ماں نے اُن سے پوچھا '' انا اتنی دیر آپ بیٹھ کر کیا دیکھتے ہیں ؟ ''

’’دعوت کا انتظار‘‘ انا نے کہا۔ تھرّاتے قدموں سے وہ الماری کے پاس گئے ’’ابھنگ گیتا نجلی ‘‘ کھولی۔ کانپتی آواز میں پڑھنے لگے ۔

’’ماجھیا گرہ دواری اے اُنی ٹا کلا۔ تُو از ودھاڑی لاٗمُر تیو دوت
پرتی راہونی آلا ہا گھےاون   تجھے نمنترن مزلا گی..........‘‘

اُس کے بعد ایک دو ہفتے کے اندر ہی دعوت نامہ لے کر آئے ہوئے موت کے فرشتہ کو اُن کا پتہ مل گیا۔ مجھے بیلگاؤں میں انا کے چل بسنے کا تار آیا۔ اس وقت پروفیسر پ۔ ل۔ دیشپانڈے رمی کا داؤ جمائے بیٹھے تھے!

☆ ☆ ☆

(گنگوت)

مصنف کی دیگر تصانیف

۱۔ اردو ادب اور گاندھیائی افکار مرتب

۲۔ باقی نشاں ہمارا (حب الوطنی پر مبنی کہانیاں) مرتب

۳۔ دریچہ (مراٹھی تخلیقات کے تراجم)

۴۔ بجلی نے کہا دھرتی سے (ڈرامہ) ترجمہ

زیر طباعت

۱۔ پریم چند نئی جہتیں (مرتب)

۲۔ یادوں میں بسے لوگ (قلمی خاکے)

۳۔ اپنے قلم سے (مضامین)

۴۔ ورق گردانی (تبصرے)

AKS

(Marathi sketches written by : P. L. Deshpande)
Translation into Urdu by : Mohammad Husain Parkar

ISBN 81 - 902- 435-3-5

محمد حسین پرکار کی پیدائش ۲۲/جون ۱۹۳۹ء کو بانکوٹ ضلع رتنا گیری، مہاراشٹر کی سرزمین پر قاضی پرکار خاندان میں ہوئی۔

دفتری امور کے مطابق آپ کی تاریخ پیدائش ۱۰/مئی ۱۹۳۸ء درج ہے۔ بحیثیت انسان محمد حسین پرکار اصول پرست، نیک طینت اور صالح طبعیت کے مالک جانے جاتے ہیں۔ آپ نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے ہی اسکول میں حاصل کی۔ ہائی اسکول کی تعلیم نیشنل ہائی اسکول داپولی ضلع رتنا گیری میں حاصل کی، اسماعیل یوسف کالج جوگیشوری، ممبئی اور ممبئی یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اس کے علاوہ مانچسٹر یونیورسٹی (انگلینڈ) سے تعلیمِ بالغاں میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما حاصل کیا۔ آپ کو لکھنے پڑھنے کا شوق اسکول کے زمانے سے ہی رہا ہے چنانچہ آپ کالج کے وال پیپر اور میگزین کے لیے بہت کچھ لکھتے رہے اُس کے ساتھ اُردو رسائل میں مختلف موضوعات پر مضامین بھی شائع ہوتے رہے۔ آپ کو اردو کے علاوہ مراٹھی زبان پر بھی عبور حاصل ہے اسی سبب آپ مراٹھی ادب کو بڑے ہی چابکدستی سے اردو کے قالب میں ڈھال لیتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ''عکس'' اس کی عمدہ مثال ہے۔

हिन्दुस्तानी प्रचार सभा, मुंबई

ہندستانی پرچار سبھا کی اشاعت